ایک ٹانگ کی گڑیا
کُنور سین

کنور سین

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹۔ گولا مارکیٹ ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پہلی بار : اگست ۱۹۸۱ء

قیمت : بیس روپے ۲۰

کتابت : ریاض دہلوی

مطبع : نعمانی پریس - دہلی

زیر اہتمام :

پریم گوپال متل

ترتیب

ملاوی

کے چرنوں میں!!!

سودیش

راکیش

مالتی

کے نام

والدِ محترم

آر۔ آر۔ بھوچر

کی نذر

خیر مقدم

کنور سین کی کہانیاں اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ موضوع، تکنیک، ہیئت، اسلوب، زبان و بیان اور فضا کے لحاظ سے ان کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کہانیاں کہانی کار کے گہرے تجربے، مشاہدے اور احساس کی آئینہ دار ہیں۔

مَیں نے کنور سین کو بطور کہانی کار جنم لیتے اور پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ اگر وہ کہانی کار نہ ہوتا تو سنگیت کار ہوتا۔ اُس صورت میں وہ سُر اور تال کا جادو جگاتا۔ ذات کا اظہار بہرحال اُس کی شخصیت کی واحد مانگ ہے۔

کنور سین اتیہاس کی رمز اور انسانی سرشت کی ایمائیت کا نباض ہے۔ اتیہاس کو بیک وقت چتر پٹ، ناٹک، کرولا اور تماشائی بنا ڈالنا اُس کا کارنامہ ہے۔ انسانی سرشت کے اصل کو بھی وہ اتیہاس کے آئینے میں دکھانے پر مُصر ہے۔ دھرت راشٹر کے بعد، گلیڈی ایٹر اور لہو کی بُو اس کا ثبوت ہیں۔

"اُوپر کا پانی" میں کنور سین سنگیت کار اور اتیہاس کار ہونے کے ساتھ ساتھ پُرانی دیومالا کا یاتری اور نئی دیومالا کا خالق نظر آتا ہے۔ یہ کہانی اُسے عظیم تخلیق کار ثابت کرتی ہے۔ کہانی کا منظر نامہ تکمیلِ فن کا نادر نمونہ ہے۔ مَیں تو اسے آکاش گنگا یا کہکشاں کہنا پسند کروں گا۔

جانے والوں کو الوداع، آنے والوں کا خیر مقدم۔

سمندر پار جا کر بھی کنور سین ویسا کا ویسا لوٹ آیا۔ اگر دولت مند ہوتا ہی اُس کی

فطرت کا حصّہ ہوتا تو وہ "دھند اور دھول" جیسی کہانی ہرگز نہ لکھ پاتا نہ وہ "ریگستان کا باپ" جیسی تخلیق کو جنم دے سکتا۔

"نیلا تھوتھا پینے والا"، "ایک ٹانگ کی گڑیا"، "اس بار نہیں"، "منزل"، "پانڈولپی" اور دیگر کاوشیں بھی وقت اور مقام سے ماورا ہیں اور کشور سین کے ممتاز افسانہ نگار ہونے کی قسم کھاتی ہیں۔

کشور سین کے ساتھ میری ہر ملاقات میرے اس احساس کو پختہ کرتی رہی کہ اُس کی فنی عمر مجھ سے زیادہ ہے حالانکہ وہ مجھے "گرودیو" کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ مَیں نے اُس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور تا حیات اُس کی تخلیق میں میرا اعتقاد قائم رہے گا۔

اِسلام کے آغاز سے پہلے عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی قبیلے میں کسی نئے شاعر کا اتہ پتہ ملتا تو پورا قبیلہ اُس کا خیر مقدم کرنا اپنا ایمان سمجھتا۔ کشور سین کا خیر مقدم کرتے ہوئے میں قبل از اسلام کے اُسی عربی ماحول میں سانس لے رہا ہوں۔

اے روشنئ طبع تو بر من بلا شُدی

یہ کہتے ہوئے میں کشور سین کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتا ہوں

زبانِ یار من تُرکی و من تُرکی نمی دانم!

کشور سین کو جاننا اتنا آسان نہیں۔ میں اپنے قلم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کشور سین مجھ میں ہوتے ہوئے بھی مجھ سے الگ ہے۔

دلیونل رستیار تھی

۲۲ جون ۱۹۸۱ء

ریگستان کا پاپ

یہ کیسی رات ہے! بس میں ہی جاگ رہا ہوں۔
اپنے پر جھنجھلاتے ہوئے قافلہ سالار نے پیڑوں کے نیچے خیمے میں سوتے خراٹے بھرتے مسافروں کو غور سے دیکھا۔
آسمان تو آج کی مانند روز آگ برساتا ہے۔ وہ ہوا بھی کئی بار وقت سے پہلے ہی چلنے لگتی ہے۔ لیکن آج یہ سب ...

وہ ایک طرف بیٹھے جگالی کرتے اونٹوں کو دیکھنے لگا۔ اُن کے پاس پڑے سامان کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں:
بھروسے سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں ـــــ اِس کی اوٹ ...

اُس نے ایک بار پھر کمر سے لٹکتے خنجر کو چھو کر دیکھا ـــــ آگ میں تپتے ریگستان کی اُڑتی ہوئی ریت میں دم توڑتے بے حال مسافروں کے تصور سے ایک بار پھر من ہی من اُدھیڑ بُن میں کھو گیا:
یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر کوئی بھی قافلہ سالار ...

اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اونگھتے اونٹوں کے سر اونچے اُٹھتے گئے۔

گردنیں لمبی کیے نتھنے پھیلائے وہ اجنبی بُو کو سونگھنے لگے۔
اِس سے پہلے کہ وہ اُن کو پچکارے اُونٹ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
اِس سے پہلے کہ وہ اُن تک پہنچے اُونٹ بدکنے لگے۔
سکتے ہیں آگر وہ اُن کی طرف دیکھنے لگا۔
اُس نے چاہا چیخ کر لوگوں کو جگائے لیکن اُس کی آواز گلے سے باہر نہ نکلی۔

اُونٹوں نے اُسے چھلانگ لگا کر اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ رسیاں تُڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔
اُونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں کیوں چُپ ہو گئیں؟
ایک بھی آواز نہیں جو ریگستان کے سنّاٹے کو ختم کر سکے۔
اُس کے ہوش گم ہونے لگے:
کہیں وہ گھڑی تو نہیں آگئی!
ایک اُلجھن اُسے جکڑنے لگی۔
وہ اٹل گھڑی!
وہ بڑبڑایا۔

وہ اونٹوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز اُس کے کانوں تک پہنچی۔ اُس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔
دُور سے ایک دھبّہ آتا دکھائی دیا۔
قریب آتے دھبّے کے ساتھ ساتھ کراہنے کی آواز اونچی ہوتی گئی۔
اُس سے پہلے کہ وہ وہاں سے بھاگ جانے کا فیصلہ کرے ایک ادھیڑ عمر آدمی کمر میں چیتھڑا لپیٹے اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔
اُس نے اجنبی کے جسم پر اَن گنت زخم دیکھے جن سے پیپ رِس رہی تھی۔
زخموں سے ہونے والی خارش کے کارن اُن کو ناخنوں سے کُریدتے ہوئے اجنبی زور سے کراہنے لگا اور اُس کی طرف سُرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے چیخ اُٹھا:

بیٹھ جاؤ !

کس لیے ؟ قافلہ سالار ممیایا۔

مجھے ایک کہانی سنانی ہے۔

تم کون ہو ؟

مجھے نہیں پہچانتے ؟ ابھی کچھ دیر پہلے تم مجھے یاد کر رہے تھے۔

کیا کہا ؟ میں تمھیں یاد کر رہا تھا ؟

جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ۔ جہاں کھڑے ہو وہیں بیٹھ جاؤ۔

لیکن تم کون ہو ؟ قافلہ سالار نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

اجنبی نے جواب دینے کی بجائے چشمے سے چلّو بھر پانی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پانی نیچے ہو کر اُس کی پہنچ سے پرے ہو گیا۔

یہ دیکھ کر قافلہ سالار گھبرا گیا۔ لیکن وہ اجنبی کے گھناؤنے چہرے اور ریپپ بھرے جسم سے نظریں نہ ہٹا سکا۔

اجنبی اپنے جسم کو بُری طرح کھجاتے ہوئے کہنے لگا :

کسی وقت ریگستان اتنا ویران نہ تھا۔ نخلستان اتنے کم نہ تھے۔ لوگ یہاں سے گزرتے ہوئے اتنے خوفزدہ نہ ہوتے ۔ یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب میں نے اپنے باپ کی موت کے بعد قافلوں کو ریگستان کا لمبا سفر طے کرانے کا کام سنبھالا۔ لوگ مجھ پر بھروسہ کرتے کیونکہ میں ریگستان کے چپے چپے سے واقف تھا۔ کہیں بھی ریت اُٹھا کر اُسے سونگھتے ہی بتا دیتا کہ نخلستان وہاں سے کتنی دور ہے۔

علاقے کے تمام اونٹ مجھے پہچانتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں میرے لیے جو پیار تھا وہ میری ایمانداری کا ثبوت تھا۔

میں اُن کے ساتھ ہوتا تو کاروان کے بھٹکنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اِس لیے ہر قافلہ رہنمائی کی خاطر ہفتوں میرا انتظار کرتا۔

اپنا قصہ کہتے ہوئے اجنبی نے ایک بار بھی جسم کو نہ کھجایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے زخموں میں اُبلتی پیپ ٹھنڈی پڑ گئی ۔

اِس سے پہلے کہ وہ آگے سنانا شروع کرے اُس نے قافلہ سالار کو خونخوار نظروں سے دیکھا

قافلہ سالار کا لہو جمنے لگا۔

اُس نے چاہا نظریں جھکا لے لیکن اجنبی نے ڈراؤنا قہقہہ لگایا۔

تُم مجھے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کیا کہانی سُننے کے ساتھ تمہارے گھناؤنے جسم کو دیکھنا ضروری ہے ؟

بالکل! ورنہ تم اپنا چہرہ کس آئینے میں دیکھو گے ؟ ہاں، تو سنو :

ایک دن دس سوداگر میرے پاس آئے۔ اُن کے سو اونٹ لدے کھڑے تھے۔

اُنھیں ریگستان پار کرنے کی جلدی تھی۔ میں ابھی سفر سے لوٹا تھا، تھکن سے نڈھال۔

اُنھوں نے اصرار کیا —— تمہارے سوا ہمیں کسی پر بھروسہ نہیں ہمارے گھر والے بھی تم پر یقین رکھتے ہیں تمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔

دوسرے دن سویرا ہونے سے پہلے ہی ہم چل پڑے۔

سورج سر پر تھا میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچنے لگی۔

سو اونٹوں کی لمبی قطار دیکھ کر میں سنہرے سپنے بُننے لگا۔

اونٹوں پر لدا مال مجھے بے قابو کرنے لگا۔

میرے جی میں آیا —— ایک دن میں پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ جلتے ہوئے ریگستان کی تپتی ہوئی کوکھ سے نکل کر میں جہاں چاہوں جا کر آرام کی زندگی گذار سکتا ہوں۔

لمبے سفر کی مشقت سہتے جانے کتنے برس بیت گئے۔

یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ گھر والے دُعائیں دیں گے۔ زندگی بھر کباب ہوتے رہنے سے بچ جائیں گے۔

آرام کی زندگی کسے نہیں چاہیئے۔ سو اونٹوں پر لدا مال ...

یہ کہہ کر اجنبی نے آسمان تک پہنچنے والا نعرہ لگایا اور اپنے بدن کو بڑی طرح گھمانے لگا۔ اُس کی چیخ پُکار ریگستان میں دُور دُور تک پھیل گئی۔

قافلہ سالار نے دیکھا چشمے کا پانی اور بھی نیچا ہو گیا ہوا کے نہ چلنے پر بھی پتّے کھڑکھڑانے لگے۔

پتّے اتنی جلدی کیسے سُوکھ گئے! آسمان کو چھونے والے نعرے اور چیخ پُکار سُن کر

بھی خیمے میں سوئے ہوئے لوگ کیوں نہیں جاگے ؟ اُس کا دماغ کام کرنے سے رہ گیا۔

اجنبی چلایا:

تم کس سوچ میں پڑ گئے ؟ میری طرف دیکھو۔

دوپہر ہوئی تو گرمی کی شدت پر غور کرتے ہوئے میں نے سب لوگوں کو اپنے چہروں پر گیلا کپڑا لپیٹنے کو کہا۔

وہ اونگھنے لگے تو اونٹ سے اُتر کر میں نے خنجر نکالا اور اونٹوں پر لدی پانی سے بھری مشکوں کو چیرنے لگا۔

میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا جب مجھے دسویں مشک میں چھرا گھونپتے دیکھ کر تمام اونٹ اپنے مالکوں سمیت بے تحاشہ بھاگ نکلے۔

میرا اونٹ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔

وہ کچھ دیر بڑبڑایا اور گردن لمبی کیے مجھے چبا ڈالنے کو جبڑے کھولنے لگا۔

میں اُس سے بچ کر سرپٹ بھاگا۔

اونٹ نے میرا پیچھا کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دُوری پر ایک گڑھا ہے۔

وہاں پہنچ کر میں اُس میں کود گیا۔

گڑھے میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھا اونٹ منڈیر پر گردن رکھے میری طرف جھانک رہا تھا۔

وہ دن بھر بیٹھا مجھے گھورتا رہا۔

تھک ہار کر میں سو گیا۔ میری آنکھ کھُلی تو رات کا تیسرا پہر بیت چکا تھا۔

میں نے کروٹ بدلی تو میرا پاؤں کسی نرم چیز سے چھُو گیا۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک ڈراؤنا سانپ کنڈلی مارے سو رہا تھا۔

خوف سے میری چیخ نکل گئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔
اپنے کو سمیٹ کر میں گڑھے کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔
مجھ میں کھڑا ہونے کی طاقت نہ تھی۔
میری چیخ سن کر سانپ جاگ اٹھا اور عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔
زخموں والا اجنبی چپ ہوا تو قافلہ سالار کانپ رہا تھا۔
آس پاس عجیب آوازیں اٹھ رہی تھیں۔
گھاس کو چھو کر دیکھا وہ مر چکی تھی۔
چشمے کا پانی اور بھی نیچا ہو گیا تھا

وہ مری ہوئی آواز میں بولا ——
آگے کہو۔ چپ کیوں ہو گئے ؟
زخموں والے اجنبی کی دردناک چیخ ہوا میں گونج اٹھی اور اس نے کہنا شروع کیا:
پھر کیا تھا۔ سانپ نے اپنا پھن میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔
پھر میں نے دیکھا سانپ نے دودھیا منکا اگل دیا۔
اب سانپ نے پھن کے سہارے میرا ہاتھ اوپر اٹھایا اور میرے منہ کے قریب لے
گیا۔
میں سمجھ گیا کہ وہ یہی کہہ رہا ہے کہ منکا منہ میں ڈال لو۔
منہ میں ڈالتے ہی منکے میں سے شہد کی طرح میٹھا دودھ ٹپکنے لگا۔
میں دودھ کا مزا لیتے ہوئے اللہ کا شکر بجا لایا۔
سانپ کو رحمت کا فرشتہ سمجھ کر میں اس کے آگے جھک گیا اور منکا اسے لوٹا دیا۔

گھڑی بھر چپ رہنے کے بعد زخموں والے اجنبی نے کہنا شروع کیا:
سویرا ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ سانپ گڑھے کے اوپر جانے لگا۔
جب اس کا پھن منڈیر سے جا لگا تو دم ہلا کر اس نے عجیب اشارہ کیا۔
اس کی دم پکڑ کر میں گڑھے سے باہر نکل آیا۔

اب مَیں نے محسوس کیا کہ منکے سے ٹپکتا دودھ پی کر ہی مجھ میں یہ پھرتی آئی۔

قافلہ سالار نے دیکھا کہانی کے یہاں آتے ہی چشمے کا پانی اوپر اُٹھنے لگا۔

اجنبی بولتا گیا ــــــ

گڑھے سے باہر آتے ہی میں نے دیکھا اونٹ مرا پڑا تھا۔

سانپ میرے آگے آگے چلنے لگا۔

جانے کس کشش سے کھنچا میں اُس کے پیچھے چلتا رہا۔

چلتے چلتے میرے دِل و دماغ پر سانپ کے پھن میں چھپا منکا چھا گیا۔

میں نے یہی سوچا کہ سانپ مجھے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا کر غائب ہو جائے گا۔ اُس کا منکا بھی اُس کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔

اِس نتیجے پر پہنچتے دیر نہ لگی کہ سو اونٹوں پر لدے مال سے کہیں قیمتی ہے یہ منکا۔ اتنا قیمتی کہ شاید قارون کا خزانہ بھی اِس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

چشمے کا پانی اب بہت نیچا ہو گیا۔

پیڑوں کے بچے کھچے پتے زمین پر گرنے لگے۔

گھاس تو جل کر راکھ ہو گئی۔

منکے کو پانے کے لیے میں کتنا بے قرار ہو اُٹھا!

مجھے یہی لگا کہ اگر یہ منکا مجھے حاصل نہ ہوا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔

چلتے چلتے ہم پیڑوں کے جھنڈ کے نیچے پہنچے۔

ہری گھاس پر رینگ کر سانپ آرام کرنے لگا۔

چشمے کا پانی پی کر میری جان میں جان آئی۔

بڑے آرام سے مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پاس ہی ایک ڈنڈا پڑا تھا

میرے بازو پھڑکنے لگے۔

سانپ کی طرف دیکھ کر مَیں نے ڈنڈا اٹھا لیا اور سانپ پر وار کر دیا۔

سانپ تلملا کر ڈراؤنی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔

زمین میں گڑا سا رہ گیا میرا وجود۔ دہشت سے تھر تھر کانپتا سا!

سانپ نے اپنا مُنہ اوپر اُٹھایا اور مجھ پر تھوک دیا۔

زہر کے چھینٹے پڑتے ہی میرا وجود جلنے لگا۔

سانپ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

چشمہ سوکھ گیا —— پیڑ مرنے لگے۔

پیاس سے پاگل ہو کر میں مارا مارا پھرنے لگا۔

اب مجھے دیکھتے ہی نخلستان غائب ہو جاتا ہے۔

تمہارے جیسا قافلہ سالار جب بھی یاد کرتا ہے میں پہنچ جاتا ہوں اور اپنی سُنا کر چل دیتا ہوں۔

قافلہ سالار میرے پیچھے چلتا ہے تھوڑی دُور چلنے کے بعد جب مَیں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو اُس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

کہانی سُنا کر زخموں والا اجنبی اُٹھ کر چل دیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی قافلہ سالار کو اُس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا۔

تھوڑی دُور چل کر عجیب آوازیں اُس کے کانوں پر تھاپ دینے لگیں۔

اُسے محسوس ہوا کہ بھاگتے ہوئے اونٹ واپس آ رہے ہیں اور خیموں میں سوئے ہوئے لوگ جاگ اُٹھے ہیں ——

گلیڈی ایٹر

چتا بھڑ بھڑاتی رہی۔
کومیلا اُسے دیکھتے ہوئے پتہ نہیں کیا سوچنے لگی۔
رات کو اور بھی گھنا ہوتے دیکھ کر بولی :
لوگ کب کے لوٹ گئے۔ تم بھی جاؤ۔ مجھے پتہ نہیں کب تک رکنا پڑے....
وہ دور تک ہو آئی :
یہ کہتا تھا چتا ٹھنڈی ہونے تک پاس بیٹھی رہنا۔

کومیلا رات کی آتما میں جھانکنے کے لیے بے چین ہو اُٹھی۔
عجیب آدمی تھا میرا اس کا ملاپ بھی عجیب ڈھنگ سے ہوا۔ میں جانتی تھی۔ شاید یہ بھی جانتا تھا۔ اس کی آخری خواہش اور بھی عجیب تھی۔
تم بتاؤ اس کی راکھ ذرہ ذرہ بکھیر دینے سے سمسیا حل ہو جائے گی؟

شمشان ــــ کالا گھنگ شمشان ہنکار اُٹھا۔
کومیلا کی پرچھائیں جیسی کایا کو دیکھتے ہوئے میں سننے لگا۔
اُس میں بیٹھا کوئی عجیب ڈیزائن بننے لگا :
جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا یہ شمشان سے زیادہ بھیانک لگتا تھا۔

چھٹتی چنگاریاں شعلوں کا روپ دھارن کرنے لگیں۔

کومیسلا بولتی چلی گئی:

یہ پریشان رہنا ——— لوگ جانے کس بھرم اور گون سے ستھان کی بات کرتے ہیں!

زندگی کی گہما گہمی میں بھی یہ اکثر چونک پڑتا:

مجھے سب یاد ہے۔ کچھ بھی دھندلا نہیں پڑا۔

کوروکشیتر کی بات جانے دو۔

اُس مہایُدھ میں میرے ساتھ عجیب بات ہوئی۔

مَیں وہاں جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اپنی پریوگ شالہ میں قدرت کے ساتھ جوجھ رہا تھا۔ اُس کے سینے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہاڑ، پاتال اور سمندر کا بھید جاننے میں لگا تھا۔ آکاش میری نظروں کو بھانپ رہا تھا اور ...... تبھی میرے کانوں میں رَن بھیری گونجنے لگی۔ مَیں اپنے کو بھول گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ پچھتانے لگتا:

تم وشواس کرو میں کسی یُدھ میں اپنی مرضی سے نہیں گیا۔ کوئی دوسرا مجھے کھینچ لے گیا

——— یہ بوکھلا جاتا۔ تم نہیں جانتیں آدمی بیٹھے بیٹھے کیا سے کیا ہو جاتا ہے ———

یہ اپنی کہانی کی اور لوٹ آتا:

میرے پاس شکتی تھی۔ برسوں کی تپسیا سے پراپت کی ہوئی شکتی۔ کچھ بھی کر سکنے کی شکتی۔

اچھا ہوا اُس یُگ کی نیتی کرشن طے کر رہا تھا۔ ورنہ......

مجھے یُدھ بھومی میں اُترتے دیکھ کرشن اُداس ہو گیا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ میری شکتی کو پہچانتا تھا۔ اُسے پتہ تھا میں اُس کا ساتھ دوں گا جو ہار رہا ہوگا۔ کوروؤں کی ہار نشچت تھی لیکن میں اُن کے ساتھ ہو جاتا تو......

کرشن پانڈوؤں کی ہار سے زیادہ سرشٹی کے پورن وناش سے ڈر گیا۔

جس دن میں کوروکشیتر پہنچا اُسی شام وہ سادھو کے بھیس میں میرے پاس آیا۔ اُس نے بھکشا میں میرا سر مانگ لیا۔

لیکن میں یُدھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں حصہ لینا......! میں تلملایا۔

تم یُدھ دیکھو گے۔ اس میں حصہ نہیں لو گے۔ کرشن کی مُسکان نِردئی تھی۔ اُس

نے میری مُنڈی درخت سے لٹکا دی۔

کتھا سُنانے کے بعد یہ سٹ پٹانے لگتا:
سوال یہ نہیں کہ میں نے یُدھ میں حصّہ نہیں لیا سوال اور ہے .....

کومیلا نے ایک بار پھر کالے شمشان کی لہو میں ڈوبی جبھ کو دھیان سے دیکھا:
یہ پتہ نہیں مجھے کیا کچھ بتاتا رہتا۔ اتنا کچھ یاد رکھنا آسان نہیں۔ پھر بھی مجھے یاد ہے ــــــ
قصّہ وسطی دور میں وسطِ ایشیا کا ــــــ
یہ تڑپ اُٹھتا:
مَیں نے سدا ایک ہی نظارہ دیکھا ــــــ تلوار سان پر، تیر کمان پر ــــــ
گھوڑے کی ہنہناہٹ اور ہاتھی کی چنگھاڑ۔
لشکر ہمیشہ کوچ کرتا رہا۔
اُن دنوں بڑا اندھیر تھا۔ سب کچھ لُٹ چُکا تھا تہذیب و تمدّن کی پرچھائیں تک باقی نہ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں بیل کی راس اور کندھے پر کُدال تھی۔ پانو کے نیچے پتھریلی دھرتی۔
میں دن رات بھُومی کی بنجر کوکھ کو اپجاؤ بنانے میں لگا رہتا۔ آشا تھی ہریالی پھوٹے گی اور میرا مقدّر جاگ پڑے گا۔ اس سے پہلے میں نے پتہ نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانی۔
آدمی دانہ پانی کی تلاش میں جانور اور پرندے سے بھی زیادہ لمبا سفر طے کرتا ہے۔
اس سے پہلے کہ میں بھُومی کو مسکراتے ہوئے دیکھوں ایک دن میرے کان کھڑے ہو گئے!
دُور نقارے پر چوٹ پڑنے لگی۔ میرے دل کی دھڑکن جیسی آواز۔
میں سچ کہتا ہوں میں نہیں چاہتا تھا لیکن مَیں نے کُدال زمین پر رکھ دی۔ بیل کی راس چھوڑ دی۔ بیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ رمبھانے لگا لیٹی ہوئی کُدال کھڑی ہو گئی۔ اُس کا دستہ میرے دائیں ہاتھ کو چومنے لگا۔ بھُومی بھی آہیں بھرنے لگی۔
کُدال، بیل اور بھُومی سے موہ کے ہوتے ہوئے بھی میں نقارے کی آواز کی اور کھنچا چلا گیا۔

وسط ایشیا کا میدان جس پر اندھا یگ گدھ کے پروں کی طرح چھایا ہوا تھا۔
ڈھول اور شور۔ تلوار کی کڑکڑاہٹ اور تیر کی سنسناہٹ۔
کوئی تھا جو نقارے پر چوٹ لگا کر مجھے کھینچ لے گیا۔ وہ کون تھا میں نہیں جانتا۔

وہ بول رہا تھا:
لشکر کوچ کرے گا۔ تلوار اور ڈھال ہمارا نشان ہے اور نشانہ..... ریگستان کے پرلے سرے پر پہاڑ کے اُس پار کی ہریالی ہماری منتظر ہے۔ وہاں اناج، پانی، دولت ہے اور عورت بھی۔
لوٹ کا مال بانٹنے کا ترازو ہر ایک کی اپنی ڈھال۔ ڈھال بھر اناج، سونا، عورت جو بھی...... تلوار میان سے باہر رہے۔ مردوں کو کاٹتی۔ لہو چاٹتی۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں لشکر سے بچھڑ گیا۔ بھٹک کر جنگل میں پہنچ گیا۔ عجیب نظارہ تھا۔ جنگل میں جھاڑی کے نیچے سانپ اور نیولا چین سے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔
تھوڑی دیر میں دوسرے درندے آنے لگے۔ چھاؤں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے سر سہلانے لگے۔
۔ نہ بھیڑ بھیڑیئے کو دیکھ کر سہمی نہ بھیڑیا بھیڑ کو دیکھ کر غرایا۔ سچ کہتا ہوں چوہا شیر کی پیٹھ پر بیٹھ کر آیا۔ میں جھاڑی کی اور بڑھا کہ اُس کا پتہ توڑوں۔ اُسے چبا کر اپنے بکھرے وجود کو جوڑوں۔ لیکن یہ میری قسمت میں نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب غائب ہو گیا۔ نہ جھاڑی رہی نہ درندے۔
اُس دن سے میں جھاڑی کی تلاش میں لگ گیا۔

کومیلا رُکی۔ وہ چتا کی آنچ ناپنے لگی!
یہ کم نہیں ہوئی۔
مَیں نے کہا نہ تم جاؤ۔ مجھے پتہ نہیں کب تک یہاں بیٹھنا پڑے۔

مجھے جوں کا توں بیٹھے دیکھ کر وہ پھر اُس کی کہانی سنانے لگی:
یہ سچ کہتا تھا۔

میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔

اس کا اور میرا ملاپ بڑا عجیب تھا۔

یُدھ چل رہا تھا۔ بستی آگ میں گھری ہوئی تھی۔

یہ دھوئیں کو پار کر کے اور آگ کو چیر کر ہمارے گھر میں آدھمکا۔ اسے دیکھ کر گھر کے لوگ لرز اُٹھے۔ میں مسکراتی رہی۔

میری ماں، باپ اور بھائی کی ہتیا کر کے یہ میری اور بڑھا۔ میں نے مسکرانا بند نہ کیا۔

اس نے سنگین کی نوک میری چھاتی پر رکھ دی۔ میں پھر بھی مسکراتی رہی۔

دوسرے ہی پل اس کی آنکھوں کی سُرخی پگھلنے لگی۔ جبڑے ڈھیلے پڑنے لگے۔

ہاتھ بھی.....

بندوق ایک طرف پھینک کر یہ میری طرف لپکا جھاڑی میری جھاڑی

اس نے مجھے باہوں میں بھر لیا۔

صبح ہوئی تو اس نے دیکھا یہ میری گود میں سر رکھے لیٹا ہوا ہے۔ میں اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی ہوں۔ میری چھاتیوں پر اس کے ہونٹوں کے نشان ہیں اور میرے ہونٹوں پر اُن کی مٹھاس۔ رات بھر دُودھ اور شہد جو چوستا رہا۔

اُس دِن اس نے مجھے پہلی بار بتایا:

مجھے شروع سے بگل اور نقارے کی آواز کھینچتی رہی۔ میں نے کبھی اُدھر جانے کی نہیں سوچی۔ پتہ نہیں کون مجھے اُس طرف کا رُخ کرنے کو اُکسانے لگتا۔ دُھند بن کر مجھ پر چھانے لگتا۔ میں نہ چاہتا لیکن میں رُک نہ پاتا۔

یہ میری طرف دیکھ کر ہمک اُٹھا:

میری آنکھوں میں جمی وحشت دیکھ کر ہر کسی کا کلیجہ دہل اُٹھتا۔ لیکن تُم.....!

تُم کون ہو؟ تم کون ہو؟ یہ پوچھتا رہا۔ میں مسکراتی رہی۔ اپنی دانست میں اس کے اندھیرے مَن میں جوت جلاتی رہی — اِسے پرکرتی کا نیا رُوپ دکھاتی رہی۔

اب فوج لٹیروں کا بے ہنگم ٹولہ نہ تھی۔
اب اس کا قانون تھا اور قاعدہ بھی۔
ہر فوج کی اپنی رجمنٹ تھی۔ اُس کا نشان تھا۔ سرکار کی دی ہوئی وردی تھی اور سرکار کی طرف سے مقرر تنخواہ۔ کوئی فوج میں بھرتی ہو سکتا تھا اسے اپنی مرضی سے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ بھگوڑے پر مقدمہ چلایا جاتا اور وہ سخت سزا پاتا۔
اس نے پروا نہیں کی۔ یہ میرے ساتھ بھاگ نکلا۔ ندی نالوں کو پار کر کے اس نگری میں آپہنچا۔
دوسرے سال ہمارے لڑکا پیدا ہوا۔ یہ خوشی سے ناچ اُٹھا۔!
اسے تلوار سے بچائیں گے اور بگل کی آواز سے دُور لے جائیں گے۔
لیکن دوسرے ہی پل یہ اُداس ہو گیا!
سوال نقارے یا بگل کا نہیں۔ سوال اور ہے۔
یہ اپنے سر کو جھٹکنے لگا جیسے وچاروں کی چھان پھٹک کرنے لگا۔
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مَیں نے کبھی نہیں چاہا پھر بھی میں ..... مَیں کس کو دوش دوں؟

کومیلا نے ایک بار پھر چتا کی آگ کی طرف ہاتھ بڑھایا:
اس کی آنچ کم نہیں ہوئی۔
خیر!
ایک دن یہ کام سے لوٹا تو گھبرایا ہوا تھا:
مجھے لگتا ہے جھاڑی سوکھنے لگی۔
اِس کی بات سُن کر میں چکرائی۔ مَیں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُن میں سُرخی اُبھرنے لگی تھی۔
یہ چیخ اُٹھا:
میرے کانوں میں پھر نقارہ گونجنے لگا۔
لشکر کے کوچ کرنے کی آواز آنے لگی۔

لگتا ہے مجھے تلوار بلانے لگی۔

میں کیا کروں!

کچے گوشت کا ذائقہ اور گرم لہو کا سواد میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شاید یہ میرا وہم ہے۔

کوئی اور وجہ بھی تو......

یہ اپنے بچے کی طرف اداس نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس دن میں مسکرا نہ سکی۔

اس دن سے اِس کی حالت خراب ہونے لگی۔ رات دن کراہتا۔ چیختا چنگھاڑتا رہتا

کونے میں پڑی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور آنے والے یدھ کی خبر سناتا۔

ایک دن یہ مٹھیاں بھینچنے اور دانت کٹکٹانے لگا!

مجھے بتاؤ آج کل گلیڈی ایٹر کا تماشا ہوتا ہے یا نہیں۔

میں حیرت سے اسے تکنے لگی تو یہ ہنس پڑا۔

میں جھوٹ نہیں کہتا۔ گلیڈی ایٹر کا کرم میں نے اپنی مرضی سے نہیں نبھایا۔ وہ تو

میں پکڑا گیا اور سدھایا گیا۔ لیکن سوال صرف میرے پکڑے جانے کا یا سدھائے جانے

کا نہیں سوال اور بھی ہے۔

یہ اپنے کو کھوجتے کھوجتے گلیڈی ایٹر کی کہانی سنانے لگا:

پرانی بات ہے یونانی غلاموں کی تجارت کرتے۔ کئی ایک گلیڈی ایٹر اکھاڑے

چلاتے۔ جوان، تندرست اور توانا غلام خرید لاتے۔ انھیں خوب پالتے۔ فولاد میں ڈھالتے

داؤ پیچ بتاتے۔ چھری چلانا سکھاتے۔

پٹھے تیار ہو جاتے تو شہر میں منادی کرائی جاتی۔ بادشاہ ملکہ اور امیروں کبیروں تک

خاص دوت کے ہاتھ خبر بھجوائی جاتی۔ تماشے پہ ٹکٹ لگایا جاتا۔

لوگ اکھاڑے کے گرد بیٹھ جاتے تو غلاموں کی جوڑی چھوڑی جاتی۔ دونوں کے

ہاتھوں میں خنجر ـــ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑنے کو تیار۔

یہاں پہنچ کر یہ لمبی سانس لیتا:

میں قسم کھاتا ہوں بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کبھی نہ چاہتے لیکن وہ نہ ٹلتے۔

اکھاڑہ خون سے لال ہو جاتا۔ غلام ایک دوسرے کی تکا بوٹی اڑاتے۔ تماشائیوں کا دل بہلاتے۔ اکثر وہ گوشت کے ٹکڑے امیر زادیوں کے ہاتھوں میں تھماتے۔ شہزادیاں اور ملکہ گوشت کے لوتھڑوں کو دباتی رہتیں، مسکراتی رہتیں۔

آخر ایک غلام دوسرے کو گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتا اور اپنا خنجر اس کے دل پر رکھ دیتا۔ اس وقت بادشاہ اپنی جگہ سے اٹھتا۔ اکھاڑے میں آتا۔ نیچے پڑے غلام کے سینے میں خنجر کو آہستہ آہستہ اترتے ہوئے دیکھتا اور خوشی سے تالیاں بجاتا۔ غلام کا تڑپنا اسے بہت بھاتا۔

کہانی سناتے سناتے یہ چیخ اٹھتا:

مجھے اکھاڑے میں لے چلو۔ مجھے اکھاڑے میں لے چلو ——

کومیلا نے چتا کی اور دیکھ کر آہ بھری:

اس کے پاگل پن کو بڑھتے دیکھ کر میں نے ترکیب سوچی۔ میں اسے مرغوں، مینڈھوں اور سانڈوں کی لڑائی دکھانے لے جانے لگی۔ اس کی کچے گوشت کی بھوک اور گرم لہو کی پیاس بجھانے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔

یہ بڑے شوق سے دیکھتا رہتا۔

اکھاڑے کے کنارے بیٹھا قہقہے لگاتا، سیٹی بجاتا۔ لہولہان جانوروں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لیکن گھر آتے ہی اداس ہو جاتا۔

کل یہ بہت اداس تھا۔

اس نے اکھاڑے میں جانے سے انکار کر دیا:

جانوروں کے خون سے طبیعت اکتانے لگی۔ مجھے پرانی بو بلانے لگی۔

شام ہوتے ہی یہ کلبلانے لگا۔ ایک ہی رٹ لگانے لگا:

سچ بتاؤ داتا دَرن میں بارود کی بو ہے یا نہیں۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ اور بھی اُداس ہو گیا:
آج فیصلہ ہو جائے۔
یا میں یا مجھ میں چھپا.....
یہ چونک پڑا۔
تمھیں ملٹری بینڈ کی دُھن سُنائی نہیں دیتی؟
وہ مُجھے بُلا رہے ہیں۔ مجھے بھی پیٹ اور پیٹھ پر بم باندھنے ہیں۔
مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ اپنا کرم نبھانے دو۔

اس کی حالت دیکھ کر میں بلبلائی:
تم نے مجھے گلیڈی ایٹر کی دُکھ بھری کتھا سُنائی۔ اب تم.....
میری بات سُن کر یہ کانپ اُٹھا:
تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔
وعدہ کرو چتا ٹھنڈی ہونے تک اُس کے پاس بیٹھو گی اور.....

صبح ہونے سے ذرا پہلے یہ دھیرے دھیرے کونے کی اور چلنے لگا، وہاں پڑی اپنی بندوق پر نظریں جمائے۔
میں نے اسے نہیں روکا۔
اس نے بندوق اُٹھائی۔ اُس کو اچھی طرح پرکھا۔ زنگ اُتار کر اس میں گولی ٹکائی۔
یہ نچلے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں اُترنے لگا ——
میں نے اسے نہیں روکا۔
میں پلنگ پر سوتے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔
کرمیلا چونک اُٹھی:
بولنا چھوڑ کر وہ تیسری بار چتا کی آنچ ناپنے لگی:
یہ کم نہیں ہوئی۔ یہ بالکل کم نہیں ہوئی.....

دھند اور دھول

اب وہ میرے ساتھ ٹیوب ٹرین میں سفر کر رہا ہے۔

میں نے اُسے دلّی ایرپورٹ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ ہوائی جہاز میں کیسے بیٹھتا۔ وہ مجھے ایر فیلڈ میں بھی نہ اُترنے دیتا۔ اُس سے میرا سمبندھ معمولی نہیں پھر بھی میں نے اُسے دلّی میں ہی الگ کر دیا۔

ایرپورٹ پر وہ میری پتنی اور بچّے کو آنسو بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ بار بار مجھے یاد دلاتا رہا۔ میری آستین پکڑے سسکتا رہا۔ زمین پر پاؤں پٹختا ہوا اپنی جانب کھینچتا رہا۔ ہال میں مَیں تصویریں دیکھنے کا بہانہ کر کے اُس سے نظریں چُراتا رہا۔ وہ بوڑھے ماں باپ کی بجھی بجھی آنکھوں میں آئی آشا کی چمک کی یاد دلاتا رہا۔ بھائی بہنوں کے زرد چہروں پر کھلی امید کی طرف اشارہ کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا تو اُس کی تسلّی کے لیے مَیں نے پتنی کو چوما۔ اور ننھے راجو کو چھاتی سے لگا لیا۔ اُس کا گلا رُندھ گیا۔

پتنی پھر اُداس ہونے لگی۔ راجو میرے ساتھ چمٹ گیا۔ بھائی بہن نراش ہونے لگے۔ ماں باپ کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

مَیں نے ایرپورٹ کے گیٹ سے باہر دیکھا۔

سڑک ویران تھی۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ زرد پتّے ناچ رہے تھے۔ اُس پار بس اسٹینڈ اُونگھ رہا تھا۔ اُس سے بھی پرے کھوکھے والا میلی چائے چھان رہا تھا۔

"یہاں بھی کیا دھرا ہے؟" میں کسمسایا۔

میری بات سن کر اُس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

بمبئی میں ہوٹل کے کمرے میں قدم رکھتے ہی میں حیران رہ گیا۔ وہ بستر پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔

"میں نے سوچا تھیں یہاں تک تو چھوڑ ہی جاؤں۔" وہ اُٹھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"میں نے تمھیں ساتھ آنے سے منع کیا تھا۔"

"تمہارے منع کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ دلیش کی سیاحت تک تمہارے ساتھ رہنے میں ہرج کیا ہے؟" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، "اب لینے کی نہ سوچو۔" مجھے بستر کھولتے دیکھ کر بولا، "آج پونم کی رات ہے۔ دو قدم پر سمندر ہے۔ دِلی چھوڑنے سے پہلے تم گنگا سنان کو نہ جا سکے۔" اُس نے کان پکڑ لیے اور زبان دانتوں میں دبالی۔

"صرف اس لیے تم ...؟"

"سمندر کو چلو۔ یہ پانی!" وہ جھینپ گیا "تم چنتا نہ کرو۔ میں لوٹ جاؤں گا۔ یہیں سے لوٹ جاؤں گا۔ تم ایک بار ..."

لہر اور شہر کے بیچ کھڑی دیوار پر بیٹھا میں سمندر اور چاند کا کھیل دیکھتے ہوئے اُسے بھولنے لگا۔ سپنوں کی دُنیا بسنے لگی۔ سویرا ہوتے ہوتے وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے سات ٹمن ڈالر کے لیے جہاز پکڑ لیا۔

بیروت ایرپورٹ کی بالکنی میں کھڑا میں سرد ہوا کے جھونکوں، سرسبز پہاڑیوں اور نیلے سمندر کے سوا سب کچھ بھول گیا تھا۔ ٹرک پر ناچتے پتّوں اور بادلوں کی دُنیا میں کبھی کبھار ڈگمگاتے جہاز کو بھی میں نے ایرپورٹ کے شاپنگ سینٹر میں جھکتے مسکراتے حُسن پر بھی دھیان نہیں دیا۔

دھیان تو میں نے ایرہوسٹس کی طرف بھی نہیں دیا جو مجھے ہوائی جہاز کے کچن میں لے گئی۔ اُسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ میں ویجی ٹیرین ہوں۔ جہاز میں صرف نان ویجی ٹیرین لنچ تھا۔

"تم کچن میں آجاؤ۔" لنچ ختم ہوتے ہی اُس نے میرے کان میں کہا۔

"کیوں؟"

"میں تم کو سب کے سامنے الگ کھانا نہیں دے سکتی۔" بھوری آنکھوں سے جھلکتی دھورت

ہوسٹس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ جیسی میٹھی تھی۔

کچن میں جانے سے پہلے میں نے ایک بار پھر جہاز میں نظر دوڑائی حالانکہ مجھے وشواش تھا وہ بمبئی سے میرے ساتھ سوار نہیں ہوا۔ وہاں بھی اُڑان بھرنے سے پہلے میں نے سارے مسافروں کو غور سے دیکھ لیا تھا۔

کچن میں سینڈوچ اور آئس کریم کھاتا ہوا میں ایر ہوسٹس کی باتیں سنتا رہا۔

وہ اُداس سی لڑکی تھی۔ اپنی ملازمت سے تنگ، لمبی اُڑانوں سے بے زار۔ نت نئے آکاش میں اُڑنے اور اجنبی دھرتی پر اُترنے کا اُسے کوئی شوق نہ تھا۔ جانے کون سی بات اُس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ میں اُس کی اُداسی سے ڈر گیا اور پیٹ بھرتے ہی کچن سے نکل کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ دیر تک وہیں رہی۔

"تم بھی بھیڑ سے گریز کرتے ہو؟"

میں نے دیکھا میرے پیچھے کھڑی وہ لمبی لانبی پلکوں میں پھیلے دکھ کو میری روح میں گھولنے لگی ہے۔

"تم کچن میں نہیں رُکے،" وہ آگے بڑھ آئی۔ اور دھند کو بنتے مٹتے دیکھنے لگی "پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"کیا ہو گیا ہے اسے؟" میں نے اپنے سے ہی پوچھ لیا۔

"میں کیا کروں؟" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولتی گئی "بات کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی..."

وہ رُکی، "تم بُرا تو نہ مانو گے؟"

"ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"بات! میں نے کہا نا بات کچھ بھی نہیں، لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"اچھا سنو،" وہ ایک دم تیار ہو گئی "بات یہ ہے کہ میں اسے بھول نہیں سکتی"

وہ سنانے لگی:

"میں ایک قصبے میں پیدا ہوئی۔ قصبے سے چار کوس پر ندی بہتی ہے۔ اس کے کنارے ایک گانو ہے۔ اُس میں ایک چھوٹا سا زمیندار رہتا تھا۔ وہ میرے باپ کا دوست تھا۔ اپنی زمین پر خود کاشت کرتا۔ خون پسینہ ایک کر کے پیداوار بڑھانے کا جتن کرتا۔ باپ سے ہر بات

پر رائے لیتا۔ لیکن ہر سال دریا میں باڑھ آجاتی۔ گاؤں ڈوب جاتا۔ فصل نشٹ ہو جاتی۔ کھیتوں کا نام نشان مٹ جاتا۔ آدمی اور ڈھور ڈنگر بہہ جاتے۔ زمین دار ہمارے گھر میں پناہ لیتا۔ سیلاب کے اُترتے ہی واپس جانے کو تیار ہو جاتا۔ باپ اُس کو گاؤں چھوڑ کر قصبے میں آباد ہو جانے کی صلاح دیتا۔ اُس کی مدد کرنے کا یقین دلاتا۔ زمین دار یہی بات نہ مانتا۔ وہ کہتا:

"پتہ نہیں میں اُس دھرتی کو کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟"

وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پھر اپنے گھر کی تلاش میں ندی کی طرف چل دیتا۔"

بات ختم کرتے ہی ایر ہوسٹس نے بڑی اُکتاہٹ سے چاروں طرف نظر دوڑائی:

"بتاؤ تمھیں کچھ بھی دکھائی دیتا ہے؟"

اُس کی آواز اور لہجے نے مجھے ڈرا دیا:

"تم تو بمبئی سے ہی لوٹ گئے تھے!"

میری بڑبڑاہٹ نے ہوسٹس کو چونکا دیا۔

"میرا مطلب تم سے نہیں تھا۔ میں تو..." وہ گھبرا گئی "آؤ اندر چلیں۔ جہاز روانہ ہونے سے پہلے کافی ہی سپ کرلیں۔ جب تک دھند بھی چھٹ جائے گی۔"

کافی پیتے ہوئے ہم دونوں اپنے میں لوٹنے لگے۔ خالی پیالی میز پر رکھتے ہی ہوسٹس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ فضا میں بکھیر دی۔ میں اُسے دیکھتا ہوا اُس کی کہانی بھولنے لگا۔

"میں فرینکفرٹ تک ہی تمہارے ساتھ ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

فرینکفرٹ سے لندن کا سفر میں نے عجیب حالت میں طے کیا۔ میرے ساتھ نہ وہ، تھا نہ ایر ہوسٹس۔ شاید جہاز کی کھڑکی سے بادلوں کو دیکھتا ہوا میں اپنے سے بھی دور تھا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی سلویا اپنے ساتھ وہاں سے چڑھنے والی سگریٹ پھونکتی مچلتی مسکراتی، ہنستی گاتی لڑکیوں سے گپ بازی میں لگی تھی۔ دھیرے دھیرے سب لڑکیاں اپنے ساتھ اور آس پاس بیٹھے ایشیائی مسافروں سے بے تکلف ہونے لگیں۔ کئی ایک اُن کے ساتھ جام ٹکرانے لگیں۔ کچھ ایک اُن کے وطن اور گھر بار کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں بھی اُن کو دیکھتا ہوا سلویا کی باتوں کا جواب دینے لگا۔ وہ بھی باقی سب کی طرح ہر دوسرے لمحے

کے آخری سنیچر وار کو فرینکفرٹ سے لندن جاتی۔ لندن میں اُس کا گھر تھا۔

"کیا لندن میں تمہارا کوئی ہے؟" اُس نے میری سگریٹ سلگائی۔

"نہیں تو! ہاں، لیسٹر اور برمنگھم میں ہے۔" میں ہڑبڑایا۔

"کون ہے؟" وہ مُسکرائی۔

"کچھ دوست، بچپن کے ساتھی، پال، چندر، پردمن۔"

"ماں، باپ، بھائی بہن؟" سِلویا سوچ میں پڑ گئی۔

"میں نے کہا نا میرے دوست..."

"گڈ! ویری گڈ!!" وہ میرا من رکھنے کو مُسکرائی اور پھر مجھے چھوڑ کر دوسری لڑکیوں سے باتیں کرنے لگی۔

لندن میں وہ، میرے ساتھ نہیں اُترا۔ میں نے جہاز سے اُترتے ہی چاروں طرف دیکھا۔ وہ، کہیں نہ تھا۔ ہر طرف رنگ برنگی بتیاں تھیں۔ اوپر ہوائی جہاز اور نیچے مسافروں کو لاتی لے جاتی ہوائی اڈے کی گاڑیاں۔

لندن میں پال تھا جو لیسٹر سے آیا تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار کھڑا ہاتھ ہلاتا ہوا مُسکرا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ بھی ہل رہے تھے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ شیشے کی پاردرشی دیواروں کا مِلن نہیں ہونے دیتی۔

پال دیر تک مجھے اپنے سے چمٹائے رہا۔ پھر مجھ سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے کچھ کھوج رہا ہو۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تم گاؤں گئے تھے؟" اُس نے میری بات ان سُنی کر دی۔

"ہاں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" اُس نے ایک بار پھر مجھے چوما اور میرا اٹیچی اُٹھا لیا۔

ٹرین لیسٹر کی جانب بڑھتی رہی۔ ہمارے ڈبے میں بیٹھا ادھیڑ عمر کا انگریز اور اُس کی بیوی وِسکی پیتے رہے۔ تمام راستہ اُنھوں نے شاید ہی کوئی بات کی ہو۔ ایک، دوسرے کو

دیکھتے اور مسکراتے ہوئے وہ گلاس بھرتے اور خالی کرتے رہے۔ میں اُن کو دیکھتا ہوا پال کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔

"گاؤں کب گئے تھے؟"

"یہاں کے لیے چلنے سے ایک ہفتہ پہلے۔"

"مندر والے تالاب پر گئے تھے؟"

"ہاں؟"

"شام کو گئے تھے نا؟"

"شام کو ہی۔"

"تالاب میں پانی تھا؟"

"ابھی بارش ہی کہاں ہوئی ہے۔"

"اشنان گھاٹ؟"

"ٹوٹ رہا ہے۔"

"اور مندر؟"

"وہ بھی ویران پڑا ہے۔"

"کوئی پجاری وہاں نہیں ٹکتا۔"

"لوگوں نے آنا جانا چھوڑ دیا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا پھر ایک دم میری آنکھوں میں دیکھنے لگا، لیکن اگر دت! کیا اگر دت شولنگ پر بل پتر چڑھانے اور پانی کا گھڑا لڑکانے نہیں آتا؟"

"وہ تو کب کا مر چکا۔"

"اور ایسری تائی؟"

"وہ تمہارے یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد چل بسی۔"

"مجھے کسی نے نہیں لکھا۔" وہ پھر اپنے میں ڈوب گیا۔ "بازار کا کیا حال ہے؟" شاید وہ آدمیوں کے بارے میں پوچھنے سے ڈرنے لگا۔

"اب منڈی میں بھی خوب رونق ہے۔"

"تم نہر کی طرف بھی گئے ہو گے؟ وہاں کا آموں کا باغ! اس پر تو کیریاں ہی

کیریاں ...!"

وہ بے شمار معصوم سوال کرتا رہا جیسے وہاں جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔
جب میں نے اُسے بتایا کہ میں نہر کی طرف نہیں جا سکا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ اگلی بات پوچھنے سے پہلے اُسے رُکنا پڑا۔ یہ دیکھ کر میں نے بہت سارا جھوٹ بولا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس نے سارے سوال بار بار دہرائے اور مجھے جواب دیتے دیکھتا ہوا برابر خوش اور اُداس ہوتا رہا۔
میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس رات ڈبے میں میرے ساتھ پال ہی تھا۔ 'وہ' کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید بیروت سے لوٹ گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسی رات مجھے 'اُس' کی بھنک پڑ جاتی۔ 'اُس' کے ساتھ میرا سمبندھ معمولی نہیں۔

'اُس' کی پرچھائیں تو عرصے بعد نظر آنی شروع ہوئی۔
دوست یار مجھے ملنے آنے لگے۔ جو بھی آتا مجھے اکیلے میں ساتھ بٹھا کر باتیں کرنا چاہتا۔ پال کے کام پر جاتے ہی مجھے پب میں لے جا کر ایک ہی قسم کے سوالوں کی لسٹ میرے سامنے کھول دیتا۔ اُسے دہراتا ہوا بالکل پال ہی کی طرح میرے جواب سے برابر خوش اور اُداس ہوتا رہتا۔
ایک بات اور تھی جس میں سب ایک جیسے تھے۔
ہر کوئی اپنی آمدنی اور بچت کا ذکر کرتے ہوئے میرے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اُسے جوں کا توں کورا بنا دیکھ کر نراش ہو جاتا اور شراب کے بڑے بڑے گھونٹ پینے لگتا۔
چندر کے ساتھ تو ایک آنکھ والا جاٹ بھی آتا جو رات گئے اگلے ہی ہفتے ہندوستان لوٹ جانے کا کہتا اور ثبوت میں اپنی کمائی ہوئی دولت کے آنکڑے دیتا۔ دیر تک چیخنے چلانے کے بعد سسکنے لگتا اور عجیب سُر میں روتا ہوا میرے دل میں دہشت پیدا کر دیتا۔ آخر وہ لمحہ آ جاتا جب ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کی پتھر کی آنکھ بھی آنسو بہانے لگی ہے۔ اس وقت وہ اپنے گاؤں کے زندہ اور مُردہ لوگوں کو پکارتا، کھیتوں کو یاد کرتا، ڈھور ڈھنگر کو آواز دیتا ہوا اپنے ساتھ سٹ کر بیٹھی انگریز عورت کو پرے دھکیل دیتا۔
پب بند ہونے کے بعد جب ہم پال کے اڈے پر لوٹتے تو بے حد اُداس ہو جاتے۔
جس روز پال کی رات کی شفٹ نہ ہوتی وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھتا۔ پرانے

سوال دُہرانے کے بعد پوچھتا:
"تم تو دِلّی میں بھی رہے ہو۔ کیا مجھے وہاں کوئی رِل سکتا ہے؟"
مجھے خاموش بیٹھا دیکھ کر وہ وضاحت کرتا:
"بہت بڑا نہیں تو چھوٹا ہی سہی۔ بس گذارے لائق۔ میرے پاس جو کچھ ہے تمہارے خیال میں وہاں کام شروع کرنے کے لیے کافی نہیں؟"
وہ اپنی بچت کا حساب لگانے کے بعد اپنے مکان کی قیمت بھی اُس میں جوڑ دیتا اور کروٹ بدلتا:
"یہاں کب تک ... ایسے تو زندگی بیت جائے گی۔"

اب لوگ مجھے بھی اپنی طرح رات دن چھوٹا بڑا، اچھا بُرا کام کرنے اور روپیہ جوڑنے کا مشورہ دینے لگے۔ "آخر تم بھی تو ایک دن گھر جاؤ گے؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ یہاں تو ..."
اُن کی بات پر غور کرتے ہی مجھے یہاں اور وہاں کا فرق گھیر لیتا۔ دُھند اور دُھول کا انتر۔ پھر بھی مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔
اس کی پرچھائیں پہلی بار اس دن نظر آئی جب مجھے احساس ہوا کہ میرے دوست حتےٰ کر بال بچّے اپنے میں سے ایک سمجھ بیٹھے۔ وہ سب کسی اور کے یہاں آنے کے انتظار میں مجھے بھولنے لگے۔
ان کے سوال تازہ بتازہ اور میرے جواب ایک دم باسی۔

اس روز میں اپنے کیبن میں بیٹھا اپنے سے نبٹ رہا تھا۔ بار بار بکھرتا جڑتا سمندر کے آر پار آ جا رہا تھا ایر ہوسٹس، سلویا اور ایک آنکھ والا جاٹ میرے دماغ پر سوار تھے۔ دھرتی اور آکاش کی اجنبیت مجھے ڈسنے لگی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے یونٹ انچارج کے کمرے کی طرف چل دیا۔
"کیوں، کیا بات ہے؟" انچارج نے فائل سے نظریں نہیں ہٹائیں۔
"سر! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"
"گھر چلے جاؤ۔"
"مجھے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے۔" میں اپنی بات پر آپ حیران رہ گیا۔

"کیا؟" انچارج کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ اُس نے فائل چھوڑ کر نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں:

"جانتے ہو ہم ایشیائیوں کو اس کام پر کیوں نہیں لگاتے؟"

وہ اپنے سوال کا جواب خود ہی دینے لگا:

"ہم یہ تین میل میں پھیلی فیکٹری چلا رہے ہیں۔ خود رحمی کے شکار لوگوں کے لیے یہ کوئی اسپتال تو نہیں"۔

وہ پھر فائل پہ جھک گیا۔

میرے ساتھ ہی میرا سینیئر بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔

"مسٹر مرین! تم بہت جذباتی نوجوان ہو۔ اُس نے میرے کندھے کو تھپتھپایا" اس جگہ یہ نہیں چلے گا۔ پہلے بھی تمہاری شکایت ہو چکی ہے۔

"کیا؟

"میں جھوٹ نہیں کہتا تم اپنی سیٹ سے اٹھ کر ایسے ہی ادھر ادھر گھومتے رہتے ہو۔"

"دراصل..."

"دراصل کیا؟

"کئی بار مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ سڑک کی ساری دھند میرے کیبن میں گھس آئی ہے۔ میں..."

سینیئر کو سوچ میں دو بار دیکھ مجھے اُس کی دعوت کی یاد آئی۔

"آپ نے مجھے کئی بار اپنے ہاں ڈنر پہ آنے کے لیے کہا لیکن..."

"او، یس، یس! لیکن آج نہیں"۔ وہ چونکا لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل گیا۔

"آج کیوں نہیں؟

"آج میری بیوی کا بوائے فرینڈ آ رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ اکیلے میں وقت گذارنا پسند کرے گی"۔ وہ مسکرایا "آج تو میں بھی دیر سے گھر جاؤں گا"۔ وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا۔

ایسی دعوت کو سنجیدگی سے نہ لیا کرو۔

اُس رات میں نے پال کو اپنی حالت بتائی تو فکر مند ہونے کی بجائے وہ مسکرانے

رنگا:

تمہیں انچارج کے پاس نہیں جانا چاہیئے تھا۔ گھر سے ہی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے ساتھ عرضی بھیج دیتے۔ یہ لوگ بڑے۔۔۔"

رنگا گالیاں بکتا ہوا کچھ سوچنے لگا:

"میرے خیال میں تم کچھ دنوں کے لیے لندن چلے جاؤ۔ وہاں میرا ایک دوست ہے احمد علی۔ صبح کی گاڑی پکڑ لو۔ میں اسے فون کر دوں گا" وہ ٹھمکا "کمی یہاں بھی نہیں لیکن ٹھیک وہیں رہے گا۔"

احمد علی گھر پہ نہ تھا۔ میرا سواگت مارتھا نے کیا:

"مسٹر مہرچن!" مارتھا نے بیگ میرے ہاتھ سے پکڑ لیا اور مجھے اندر لے چلی:

"لیسٹر سے فون احمد علی نے ہی سنا تھا لیکن اسے اپنی آئرش بیوی کے ساتھ آئرلینڈ جانا پڑا" وہ ہنسی "آئرش عورت بہت ضدی ہوتی ہے۔"

حسین اور متوازی خدوخال والی مارتھا میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"احمد علی کہتا تھا تم بہت اداس ہو" وہ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کرو پھر۔۔۔" وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

جب مارتھا نے مجھے جگایا تو چار بج چکے تھے۔ نومبر کا سورج کب کا نیچے اتر چکا تھا۔ رات چھتوں، منڈیروں اور دیواروں سے اتر کر سڑک پر پھیل گئی تھی۔

میں نے باتھ ٹب صاف کر دیا ہے" مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ ہنسی "احمد علی یہی پسند کرتا ہے۔ ٹب میں اکٹھے بیٹھ کر بیئر یا وسکی پینا" وہ مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی "تم بہت بوجھل محسوس کر رہے ہو نا؟ احمد علی نے مجھے۔۔۔"

باتھ روم سے نکلنے کے بعد ہم نے ڈنر سے پہلے کا آخری پیگ لیا۔ مارتھا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں وہ میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ لگتا تھا باتھ روم میں ہوئی باتوں سے اس کا جی نہیں بھرا۔ ڈنر کو لگا یا چھوڑ کر وہ اٹھی اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگی:

احمد علی! کیا احمد علی! وہ بھی کوئی آدمی ہے" مجھے حیرت سے اپنی طرف تکتے پا کر

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر سُبکنے لگی۔ "تم جانتے ہو۔ شاید تم نہیں جانتے... میں احمد علی کی داشتہ ہوں۔"

کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ سنبھل گئی:

"چھوڑو یہ باتیں۔ آؤ تمھیں اپنے بیٹے کا فوٹو دکھاؤں۔" وہ مجھے وہاں سے اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

البم ایک ہی لڑکے کی مختلف انداز میں کھینچی گئی تصویروں سے بھری تھی۔ بچپن سے لے کر نو سال تک پروان چڑھتے لڑکے کی کہانی۔ اُس کے چہرے سے کسی خوب صورت مرد کے نقوش جھلکتے تھے۔ آنکھیں ہو بہو مارتھا کی۔

"کیا یہ احمد علی کا لڑکا ہے؟"

"نہیں۔"

"کس کا ہے؟" میں ایک بار پھر حیرت میں ڈوب گیا۔

"اِس کے باپ کا نام تو میں بھی نہیں جانتی۔"

"کیا؟"

"میری اُس کے ساتھ شادی تھوڑی ہوئی تھی۔ بس ایک رات کی ملاقات تھی۔ وہ بھی شراب کے نشے میں۔" مارتھا نے بات کو ایک طرف کر دیا۔ "تم یہ بتاؤ میرا بیٹا کیسا لگتا ہے؟"

"بہت خوبصورت ہے۔ لیکن..."

"تم کس چنتا میں پڑ گئے؟ اِس دیش میں لاکھوں بچے ایسے ہیں جن کے باپ کا نام ماں بھی نہیں جانتی۔"

وہ بیٹے کی تصویریں دیکھتی رہی۔ اُس کی شکل و شباہت اور صحت کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ڈنر ٹھنڈا ہوتا رہا۔ گلاسوں میں پڑی وہسکی ہوا میں اُڑتی رہی۔ صبح میں نے دیکھا مارتھا میری بغل میں سو رہی ہے۔

میں پھر اپنے کو کاٹنے اور جوڑنے لگا۔ گلی کی دُھند میری طرف بڑھتی نظر آنے لگی۔ سانس رُکنے لگی۔

مارتھا نے میری اُداسی دور کی ہے یا اپنی رُوح کا سونا پن بھی میرے اندر

آتار دیا۔

میں بار بار اُس کے بچّے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ننھے راجو کو یاد کرنے لگا۔ مجھے لگا کوئی میری آستین پکڑے کھڑا سسک رہا ہے۔ اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔

میں نے اپنے کو سنبھال کر جلدی سے پیگ تیار کیا۔

میں ابھی لیسٹر جاؤں گا۔ پال سے کہوں گا میرے لیے ٹکٹ بُک کرا دے۔

میرے ایسا سوچتے ہی دُھند دُھول میں بدلنے لگی اور میں سمندر کے آر پار ڈولنے لگا۔

مارتھا میرے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی کہ احمد علی اپنی بیوی کے ساتھ لوٹ آیا۔

"ہیلو سرجن! رات کیسی کٹی؟" احمد علی زور سے ہنس پڑا۔ اُس نے مجھے اُٹھنے سے منع کر دیا۔ پھر اُس کی نگاہیں مارتھا پر جم گئیں۔ مسز احمد علی نے میرے پاس آ کر میرے بالوں کو چوما اور ناشتہ جلدی ختم کرنے کو کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"ریٹا کے پاس تمہارے لیے پروگرام ہے۔" احمد علی نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ "یہ تمہیں ابھی ساحل پر لے جائے گی۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔

"ابھی تو سفر سے لوٹی ہے۔" میں نے ہمدردی جتائی۔

"سفر! کیسا سفر! بس ہوائی جہاز میں اپنے گاؤں پر سے اُڑان بھرنے کا شوق۔" وہ تیسری بار ہنسا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلتا لیکن مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

احمد علی کے ڈرامائی انداز سے مجھے جھٹکا سا لگا جیسے اُس نے اسے اپنی شخصیت کے بدلے اوڑھا ہو۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں ریٹا کے ساتھ سمندر میں اُتر گیا۔ لہروں سے کھیلتا ہوا میں دُور تک پھیلی دھوپ کا مزہ لینے لگا۔

پانی سے نکل کر ہم ریت پر لیٹ کر سن باتھ لینے لگے۔ پھر ریٹا نے بیئر کے جگ بھرے۔

بیئر کے بعد وسکی کا دور چلا۔

"میں اسٹرانگ ڈرنک کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" وہ میرے پاس سرک آئی۔ "تم بھی وسکی پیا کرو۔"

دوسرا پیگ ختم کرتے ہی اُس کا چہرہ تمتمانے لگا اور آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ وہ

پھر مجھ سے دُور ہٹ گئی۔

"کمبخت احمد علی! باسٹرڈ" وہ بڑبڑاتی رہی "مسز مان! وہ آج جو کچھ ہے میری بدولت! نالی کا کیڑا!

مجھے اپنی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے پا کر وہ کہنے لگی:

"احمد علی میرا دوسرا شوہر ہے پہلا ہز بینڈ تھا پیٹر۔

وہ سمندر کو دیکھنے لگی:

"میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ پیٹر اٹھارہ۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ آئرلینڈ کی سیر کرنے آیا تھا ہمارے گھر کے سامنے ٹھہرا تھا۔ ہم دوست بن گئے اور ماں باپ کو بتائے بغیر لندن بھاگ آئے۔ میرا باپ ہے۔۔۔ پیٹر سے شادی نہ کرنے دیتا۔ اُسے آئرش لارڈ کا ہی چاہیئے تھا۔"

اب تیسرا پیگ چل رہا تھا۔

"پیٹر بلا کا محنتی تھا کسی بھی کام کی پوری۔۔۔ سوجھ بوجھ رکھتا تھا میں نے بھی کام کرنا اور دنیا کو سمجھنا اسی سے سیکھا۔

"چھوٹے موٹے کام کرتے کرتے اس نے کپڑے کا دھندہ شروع کر دیا دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا خون پسینہ دولت میں بدلنے لگا۔ آخر وہ دن بھی آیا جب وہ ریٹیا اسٹور کا مالک بن گیا۔ لیکن۔۔۔"

وہ رُکی اور اپنا گلا صاف کرنے کے لیے وہسکی کا گھونٹ بھرنے لگی

"لیکن یہ خوشی زیادہ دیر نہ رہی۔ پیٹر ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گیا۔ مجھے ایک بیٹی اور بڑھتے پھولتے بزنس کے ساتھ امٹ غم بھی دے گیا

ریٹا نے آہ بھری اور ایک بار پھر سمندر کی طرف دیکھا جیسے ابدیت میں کھوئے پیٹر کو کھوج رہی ہو:

"پیٹر کے جانے کے بعد میں نے احمد علی کو اپنایا۔ اسے بزنس مین بنایا۔ آج یہ اُحمد علی اینڈ کو کا مالک ہے کل تک ایک فیکٹری ورکر تھا۔"

ریٹا خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا:

تمہاری بیٹی؟"

او، اگاربو! وہ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ اُس نے احمد علی کو کبھی پسند نہیں کیا۔" وہ پھر میرے پاس سرک آئی "تمہارا من بہت بوجھل ہے۔ میں جانتی ہوں تم کس الجھن میں لیکن میں کیا کرسکتی ہوں! میں کچھ بھی تو نہیں کرسکتی!!"

سمندر دھند اگلنے لگا اور میرا دم گھٹنے لگا تو ریٹا مسکرائی:

آئرلینڈ سے یہاں آکر بہت دنوں تک میں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ میں پردیس میں ہوں لیکن ایک دن میں نے ایک ناول پڑھا ــــ دی لاسٹ سوانز ــــ بھٹکے ہوئے ہنس ــــ اُس میں بتایا تھا:

برف باری ہوتے ہی ہنس برفانی خطے کو چھوڑ کر نچلے میدان میں چلے جاتے ــــ ہزاروں میل دُور آکر بھی وہ اپنی جنم بھومی کو نہ بھولتے۔ ادھر گرمی کا موسم شروع ہوتا اُدھر برف پگھلتی، ہنس واپس چلے جاتے۔ انہیں اپنی مٹی کھینچ لے جاتی۔"

مجھے بے چینی سے پہلو بدلتے دیکھ کر ریٹا نے میرا مُنہ چوم لیا:

"ٹریجڈی تو اب شروع ہوتی ہے۔ سو! ایک سال ہنس اپنے دیش نہیں لوٹے۔ لوگ جانتے تھے کہ پہاڑ اور سمندر اُن کا راستہ نہیں روک سکتے۔ ایسا کیوں ہوا کہ ہنس واپس نہ آئے؟ ان کے انڈوں سے نکلے بچے اُن کی راہ دیکھتے رہے۔ ہنسوں کا اپنی جنم بھومی کو بھلانا بہت بڑا دکھانت تھا۔ خطے کے بوڑھوں نے اسے آنے والے سنکٹ کی نشانی بتایا تو کھوج شروع ہوئی۔"

ریٹا بولتی چلی گئی:

"پہاڑ اور سمندر میں نہ کسی ہنس کی لاش ملی نہ پنجر۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے لوگ میدان میں پہنچے۔ وہاں ہنسوں کو دانہ چُگتے دیکھ خوشی سے ناچ اُٹھے۔ لیکن پرندوں کے پاس جانے پر ان کی خوشی اُداسی میں بدل گئی۔ ہنسوں کے پنکھ آدھے سے زیادہ جھڑ چکے تھے۔ اب وہ اُڑان نہیں بھر سکتے تھے۔ کچھ کا تو یہ حال کہ پَر پھڑپھڑانا بھی محال۔ کسے خبر اُس اناج میں کیا تھا جسے کھا کر ہنسوں کے پنکھ جھڑ گئے۔"

مجھے سٹ پٹاتے دیکھ کر پہلے تو ریٹا سناٹے میں آگئی پھر چیخ اٹھی:

"کمبخت احمد علی! باسٹرڈ! مجھے پہ کیسی ہنسی بنانے پر تل گیا۔ اس بار مجھے اپنے گاؤں پر سے اُڑان بھرنے سے منع کرتا رہا۔ لیکن میں کیسے مانتی؟ اسے کیا خبر کہ میں ناول

پڑھ چکی ہوں۔ اب میں ہر سال یہ دیکھنے جاتی ہوں کہ میرے دماغ سے میری دھرتی کی بو باس تو نہیں مِٹ گئی۔ کہیں میرے پنکھ تو نہیں جھڑ گئے"

"لیکن میں! میں تو..." میں ہکلایا۔

ریٹا کو میری کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ جلی کٹی سی کپڑے پہننے لگی۔

"تم جانتے ہو میں احمد علی کو کیوں چاہتی ہوں؟" ریٹا مسکرائی "اُس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں دیکھی ہیں؟ اُس کے گداز گال! باسٹرڈ پورا مرد ہے"

ریٹا نے ایک جگہ گاڑی روک لی:

"تم یہاں اُتر جاؤ۔ سامنے ٹیوب اسٹیشن ہے۔ نیچے جانے والی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی تم پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے MILE END کے لیے ٹرین پکڑ لینا آگے کا راستہ تم جانتے ہو"

مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے مجھے گاڑی سے دھکیل دیا۔

"ٹیوب ٹرین کا سفر بھی ایک تجربہ ہے۔ گھر پہنچتے ہی تم....." وہ ہنسی "اس سے پہلے تم اپنے کو فارم میں لے آؤ"

وہ سیڑھیوں پر ہی میرے ساتھ ہو لیا۔ پلیٹ فارم پر میری آستین پکڑ کر سسکنے لگا۔ لیکن میں اپنے کو سنبھالتا رہا۔ اُسے ڈھول کی یاد دلاتا رہا اور آپ ڈھند..

"اب وہ ٹیوب ٹرین میں میرا ہمسفر ہے اور میں اُس سے کہتا ہوں! اِس دیش کی شراب، موسم اور عورت کا کوئی بھروسہ نہیں"

میری بات اَن سُنی کر کے وہ سسک رہا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا پنکھ جھڑا ہنس!۔

پرنسپل

وہ نربت تھا۔

سر جھکائے چلنے والا۔ دھیمی آواز۔ اُداس لہجہ۔ باتیں کرتے ہوئے آنکھیں چُراتا رہتا بھلی بُری کو مُسکرا کر ٹال دیتا۔ ہوتے ہوئے بھی اپنے نہ ہونے کا احساس دلانے والا۔ سیدھا سادہ بھولا بھولا۔

بھالو لوٹ آیا تھا۔

پہلی بار وہ اپنے ساتھ کھلے بندوں جنگل لے آیا۔ پنجہ اور غُراہٹ۔ موٹی سی لمبوتری تھوتھنی۔ بالوں سے بھرا جسم۔ بھاری بھرکم۔ جبڑے دکھاتا تو گھن آنے لگتی۔

بارہ سال ہمارے ساتھ کام کرتا رہا۔ چُپ چاپ نہ کوئی چُستی نہ چالاکی۔ گِنتی کاٹتا رہتا۔

پرنسپل بننے تک وہ گائے جیسا تھا۔ نہ اس کا پنجہ نظر آیا نہ تھوتھنی میں ڈھکے جبڑے۔ کھال اور بال کی سیاہی بھی دکھائی نہ دی۔ آنکھوں کی زردی میں جھلکتی حیوانیت چھپی رہی۔ غراہٹ کا سوال ہی نہ تھا۔

پہلی بار ہم نے اُسے سنبھال لیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کبوتر پر پنجہ ڈال دیا۔ پر بند دھک پڑگئی۔ جھپٹ پڑا۔ ہم نے اُسے پرے دھکیل کر۔۔۔ دمے مار بھگایا۔ کبوتر کو بچایا۔ بے چارے کی روزی چلی جاتی۔ بڑے تلخ دن تھے۔

رات دن ایک کرنا پڑا۔ بھالو بھی آٹھ سال عدالتوں میں دھکے کھاتا رہا۔ مگر کہیں نا پتا

رہا۔ زخم چاٹتا رہا۔ ہم اُسے جنگل میں دھکیل آئے تھے

جنگلی جانور کا بستی میں کیا کام؟ اسکول چڑیا گھر نہیں۔

ہمیں یقین تھا وہ واپس نہیں آئے گا۔

ہم نے دیکھا وہ لوٹ آیا۔ پر بندھک اسکول چھوڑنے آیا۔ ہمیں اُسے سہیوگ دینے کا حکم دے گیا۔ اس کا لہجہ بڑا کورا تھا۔ ہم حیران تھے۔ اس کے لیے ایک دم پرائے ہو گئے، اُس کی جان کا دشمن اُس کا سگا بن بیٹھا! چائے پارٹی میں بھالو ہمیں اپنا سوکھا ہوا زخم دکھاتا رہا۔

"بیت گئی سو بیت گئی۔"

عجیب بات تھی۔

پورے اسٹاف نے ایک مہینے کی تنخواہ اسکول کو دان میں دے ڈالی ہر حیلے پیسہ اکٹھا کیا۔ ودیارتھیوں کی جیب ٹٹولی۔ اُن کے ماں باپ کا بٹوا کھنگالا۔ لوگوں کے آگے جھولی پھیلائی۔ اسکول میں رنگ، روغن اور ریپیری کرائی۔

سانپ کی آنکھ اور بھالو کی مسکراہٹ میں عجیب کشش ہوتی ہے۔

وہ ہمیں بھالو کی بجائے پرنسپل نارنگ دکھائی دینے لگا۔

"تجربہ آدمی کا سب ہے۔ اگر وہ ہے۔" ہم نے سوچا۔

"ہم اسکول کے لیے ہیں بچوں کے مستقبل کے معمار۔ راشٹر کی قسمت بنانے والے۔"

پرنسپل نارنگ کہتا:

"میرے لیے اسکول ہی سب کچھ ہے۔ میں نے گھر چھوڑ دیا اپنے کو تیاگ دیا۔"

"آپ لوگ بھی اپنے کو اسکول سے ارپت کر دیں۔

"گھڑی دیکھنا چھوڑ دیں۔

"کام میں جٹے آدمی کو سمے کی سدھ نہیں رہتی۔

"چھوٹا پن چھوڑ دیں گے تو بڑا بنیں گے۔"

عجیب واتاورن تھا۔

سب کچھ سُن ہو کر رہ گیا۔ سوچنے پر سجھائی نہ دیتا۔ دیکھتے ہوئے دکھائی نہ دیتا۔ سنتے ہوئے سنائی نہ دیتا۔ ہمیں تو بس پرنسپل نارنگ کے قدموں کی دھمک سنائی دیتی۔

وہ بار بار کمروں کے آگے سے گذرتا۔ ترچھی نگاہوں سے جھانکتا ہوا ہمارے کام کو آنکتا ہوا جیسے کہہ رہا ہو:

"میں دیکھ رہا ہوں۔ میں سب دیکھ رہا ہوں۔"

اکثر لگتا وہ ہمارے اندر تک گھس آیا

کام لینے کا کام کرنے کا طریقہ! کرتے ہوئے بھی نہ کرنے کا احساس رہتا۔ یہی لگتا کوئی غلطی ہو گئی

اسکول میں آئے دن فنکشن ہونے لگے۔ ہم تیاری کرتے رہے بھاگ دوڑ اور تکان۔ ہونٹوں پر مسکان۔ پرنسپل مسکراتے مسکراتے گمبھیر ہو جاتا اور گمبھیر ہوتا تو یک لخت مسکرانے لگتا۔ کبھی تو وہ ہمارے پاس سے ہنستا ہوا گذر جاتا۔

پربندھک آتا۔ بچوں کو آشیرواد دیتے۔ پرنسپل کا گن گان کرتے۔ ہم اس کے لیے نہ ہونے کے برابر تھے۔

نارنگ اور پربندھک

پربندھک اور نارنگ۔

عجیب احساس تھا۔ بھوت کی طرح سوار رہتا۔ کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ پورا ہونے کو نہ آتا۔ انتظار میں رہتے ہم سب —— کب پرنسپل سر ہلائے۔ زبان کھولے۔ کام پورا ہونے کا سرٹیفکیٹ دے۔

اسکول دلہن کی طرح سج گیا۔

دیواروں پر چارٹ نقشے، تصویریں، ماٹو۔

دروازوں پر پالش، کھڑکیوں میں شیشے۔

لائبریری میں کتابیں، لیبارٹری میں شیشیاں۔

سب صاف شفاف۔

پرنسپل نارنگ کی کرامات۔

چپراسی دن بھر حکم نامہ لیے گھومتا رہتا۔ کوئی نہ کوئی کام فخصوص وقت میں پورا کرنے کا حکم نرم اور خوبصورت الفاظ میں۔ پتہ نہیں ہمیں کڑائی اور کڑواہٹ کا احساس کیوں ہوتا رہتا۔

میں صبح سات بجے آتا ہوں —— رات دس بجے سے پہلے نہیں جاتا۔ آپ بھی اسکول

ٹائم کے بعد...."

کام۔ بلیدان۔ تیاگ..... ساز کی آواز۔

بازار، کافی ہاؤس، گھر، ہر کہیں اسکول ہمارے ساتھ۔ پرنسپل اور پربندھک پیچھا نہ چھوڑتے۔

سب تیار ہو گیا۔

پرنسپل نے گھوشنا کی:

اسکول میں سائنس کی نمائش لگے گی۔ شکشا ادھیکاری اور ڈائرکٹر آئیں گے۔ اُن کا سواگت ہونا چاہیئے۔ ودیالیہ اسکول کی عزت بڑھائے گا۔ نمائش کو کامیاب بنائے گا۔"

نمائش ہوئی۔ پرنسپل اور پربندھک افسروں کے ساتھ اسکول کا معائنہ کرتے رہے۔ مُسکراتے رہے۔ ہنستے رہے۔

ہم سب اپنی ڈیوٹی پر۔ ہلنے کی مجال نہیں۔

جانے سے پہلے افسروں نے ہم سے کہا:

"پرنسپل نارنگ محنتی، ایماندار اور لمبی نظر رکھنے والے ہیں۔ ہمارا تعاون اور نیک خواہشات اِن کے ساتھ ہیں۔ آپ ان کا حکم مانیں۔ ہم اِن کی سُنیں گے۔"

دوسرے دن سے ہوا کا رُخ بدلنے لگا۔ پرارتھنا سبھا میں پرنسپل کا بھاشن لمبا ہوتا چلا گیا۔ وہ بچوں کو بتانے لگا:

"اسکول کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی میں نے روپیہ اکٹھا کیا۔

"اسکول میں گندگی تھی۔ میں نے اسکول کو نکھار دیا۔

"اسکول میں چیزوں کی کمی تھی، میں نے سامان خریدا"

وہ روپے پیسے کے آنکڑے دینے لگا۔

"سب بچے زبانی یاد کرلیں۔ اپنے ماں باپ اور پڑوسیوں کو بتائیں۔ رقم معمولی نہیں ہے۔"

وہ لوگوں کی زبان سے اسکول کی تعریف میں نکلے جملے دہرانے لگتا:

"لوگ مجھے ماننے لگے۔ میرے کام کو پہچاننے لگے۔"

وہ افسروں کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر چھیڑ دیتا۔

ہر جملے کے بعد بچوں کو تالی بجانے کو کہتا۔

بچّے تالی بجاتے، وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا۔ اُس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ رگیں تن جاتیں۔ چہرہ دمک اُٹھتا۔

دھیرے دھیرے وہ بچوں میں عیب ڈھونڈنے لگا:

"میری نظر بہت تیکھی ہے۔ اس سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ مجھے معلوم ہے کل شام کون سا لڑکا کہاں گھوم رہا تھا۔ کیا کر رہا تھا۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں تم سب کیا سوچتے ہو۔" وہ چہرہ ہماری طرف گھماتا۔

وہ چند بچوں کو اسٹیج پر بلاتا:

"تم کلچے چھولے کی ریڑھی پر کھڑے تھے۔

تم نے مجھے دیکھ کر بھی اپنے ساتھی سے مذاق کرنا بند نہیں کیا۔

میں دیکھ رہا تھا تم کتنی بدتمیزی سے بس میں سوار ہوئے۔"

وہ یار بچوں کو ڈانٹتا ہوا وہ ہماری طرف پلٹتا:

"میرے ساتھی کہیں بھی ہوں وہ یار بچوں پر نظر رکھیں گے۔ مجھے اُن کی حرکتوں کی اطلاع دیں گے۔ ہر بات مجھ تک پہنچنی چاہیے۔ ویسے میں نے دوسرے انتظامات بھی کر رکھے ہیں۔ اسکول میں اسکول سے باہر ہونے والی کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اسکول کی اینٹیں میری آنکھیں ہیں، دیواریں میرے کان....."

وہ پھندک کے پچھلی رات ہوئی ملاقات کو لے بیٹھتا۔

"پھندک میرے کام کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ اُن کا حکم ہے میں اسکول میں ڈسپلن کو اور مضبوط کر دوں۔ آج سے اسکول میں سوائے پڑھائی لکھائی کے دوسری کوئی بات نہیں ہوگی۔ لڑکے آدھی چھٹی میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ پڑھائی لکھائی کی بات کریں۔ میرے ساتھی دھیان سے سنیں.. پھندک نے مجھے پورے حقوق دے رکھے ہیں میں اُن کا شکر گذار ہوں۔ انھیں یقین دلاتا ہوں اسکول میں کسی قسم کی پالیٹکس نہیں چلنے دوں گا۔ چغلی اور ایک دوسرے کی بُرائی نہیں ہونے دوں گا۔ ہمیں بچوں کو اس زہر سے بچانا ہے۔ چغلخور جیسا ذلیل آدمی دوسرا کوئی نہیں ہوتا....." کہاں کی بات کہاں جا پہنچتی "کچھ لوگ پھندک کے گھر کا راستہ نہیں بھولے۔"

پرنسپل نارنگ کئی بار آدھی چھٹی کے وقت اسٹاف روم میں آدھمکتا۔ ہماری کھانے کی چیزوں کو گھورنے کے بعد ہمارے چہروں پر نظریں گھمانے لگتا:

میرا خیال ہے میں بھی آپ کے ساتھ لنچ لیا کروں۔

صبح سکول لگنے سے بہت پہلے وہ دفتر میں آبراجمان ہوتا۔ جو بھی آتا اُسے پاس بٹھا کر باتوں میں لگا لیتا۔

گھنٹی بجتے ہی وہ اُٹھتا ہمیں ساتھ لے کر پرارتھنا سبھا میں پہنچ جاتا۔ اسکول ختم ہونے سے ذرا پہلے وہ کلاسوں کو ایک ایک کر کے چھٹی کرنا شروع کر دیتا۔ ایک ایک کر کے ادھیاپکوں کو گھر جانے کو کہتا!

"آپ تھک گئے ہیں۔ دن بھر پڑھانا آسان نہیں ہوتا۔ بچے مغز چاٹ جاتے ہیں۔ میں آپ کو اور نہیں روکنا چاہتا۔ شکریہ!"

ہمیں لگتا وہ ہمیں بس سٹینڈ تک چھوڑ گیا۔ بس میں بٹھا گیا۔ گھر پہنچا گیا۔ ہم جب بھی ملتے مایوس نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے۔ باتیں کرتے تو لہجہ اُکھڑنے لگتا۔ شاید ہمیں ایک دوسرے پر بھروسہ نہ رہا تھا۔ بات کرتے ہی پچھتانے لگتے۔

تربیت کی وہی چال۔ نظریں نیچی کیے مسکراتا رہتا۔ نہ پرنسپل کو بُرا کہتا نہ ہمیں ڈرپوک بناتا۔ کبھی کبھار ہنس ضرور دیتا۔ دبی دبی سی شرمیلی ہنسی۔

اسکول کی گراؤنڈ بیاہ شادی کے لیے اکثر کرائے پر دی جاتی۔ خاصی رقم مل جاتی۔ اسکول کا فنڈ بڑھتا۔ پرنسپل کی شان۔ ایسے موقع پر پرنسپل پاس ہی منڈلاتا رہتا۔ کبھی کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اُس کے آگے پیچھے گھومنے لگتا۔

صبح آتے ہی بڑے آدمی کے ساتھ اپنی ملاقات کا بکھان کرنے لگتا۔

ایک بار گورنر کسی دوست کی بیٹی کی شادی پر پدھارے۔

دوسرے دن پرارتھنا سبھا میں پرنسپل ڈیڑھ گھنٹہ گورنر ادھیکاروں اور اس کی پوزیشن پہ بھاشن دیتا رہا۔ اُس کے خیال میں ایشور آکاش سے اُتر آیا۔ اپنی گورنر کے ساتھ ہوئی بات کا ذکر اس نے ایسے کیا جیسے وہاں سے جانے کے بعد گورنر کو نارنگ کے سوا کوئی دوسرا یاد ہی نہ رہا۔ جیسے گورنر اپنے سارے حقوق نارنگ کو سونپ گیا:

"اب میں ڈائرکٹر کے ساتھ بات کرتے ہوئے گورنر کے ساتھ اپنے تعلقات کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ شکشا وبھاگ کا کوئی آفیسر میرے کہے کو نہیں موڑ سکتا۔ اب شکشا وبھاگ کی شکتی اب میری شکتی ہے۔ پرنسپل کی شکتی الگ۔۔۔

اس صبح بچے تالیاں پیٹتے پیٹتے ہاتھ لال کر بیٹھے۔ ہماری ٹانگیں دُکھنے لگیں دا تادن کیلا ہو گیا۔ اُس دن ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ سوچ میں ڈوبے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے تک کا حوصلہ نہ ہوا۔ نربت اس دن بھی مُسکراتا رہا۔ ہم نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ تھا بھی کس کام کا؟

دوسرے دن ہم نے دیکھا ایک سینیر اور دو جونیر ادھیاپک سیرنگ پرنسپل نارنگ کے ساتھ دفتر میں باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن وہ تینوں ہم سے الگ کھڑے تھے۔

جونیر ادھیاپکوں کی ہمیں زیادہ پرواہ نہ تھی۔ وہ کام چور تھے۔ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ بات تھی حساب کے سینیر اُستاد کی۔ وہ سُلجھا ہوا آدمی تھا۔ حساس اور درد مند۔ زیادتی کے خلاف کھڑا ہونے والا۔ انصاف کے لیے لڑنے والا۔ بڑے وقت میں ہم اُس کی جانب دیکھتے۔ اُس کا نارنگ کے ساتھ ہو جانا بہت بڑی دُرگھٹنا تھی۔ ہماری ہمت توڑنے والی ــــ ہمیں چنتا کے ساگر کے عین بیچ ڈھکیل دینے والی۔

کیسا وقت آن پڑا؟

ہم کچھ نہ کر سکتے۔

ادھیاپکوں کی ترقی کا معاملہ تھا۔ کوئی اُلجھن نہ تھی۔ ہر کوئی جانتا تھا کیسے ترقی ملتی ہے۔ کون کتنی دیر سے کام کر رہا ہے۔ کون کس سے سینئر ہے اسکول کا رجسٹر اور ریکارڈ گواہ تھا ہر بات کا۔

شکشا ادھیگ معاملہ پربندھک کو نہ بھیجتا۔ ہماری بات پر دھیان نہ دیتا۔ ہماری بڑبڑاہٹ سنتا نہ سٹ پٹاہٹ دیکھتا۔ آنا کانی کرتا جاتا۔ ہم رونے لگتے تو کہتا:

"پرنسپل نے سفارش نہیں کی"۔

ہم شکشا ادھیکاری کے پاس جاتے۔ وہ دنوں ٹالنے کے بعد ہماری بات سُنتا۔ جواب کورا دیتا:

"پہل پرنسپل یا پربندھک کو کرنی ہے۔ جب تک وہ معاملہ ہمارے پاس نہیں بھیجتے ہم کچھ نہیں کر سکتے"۔

ہم اُسے اپنی طاقت کا استعمال کرنے کو کہتے۔ وہ نہ سُنتا۔ اُلٹا پربندھک کے نام چٹھی لکھ کر آئے

ہمارے خلاف ڈسپلن توڑنے کے جرم میں کارروائی کرنے کو کہتا۔ پرنسپل وہ چٹھی ہماری ابھی فائل میں لگا دیتا۔ کہیں بھی دکھا دیتا۔ چٹھی بچھو کا روپ دھارن کر لیتی۔ غرانے لگتی۔ جبڑے دکھانے لگتی۔

مہنگائی کا زمانہ۔ بال بچوں کا ساتھ آدھی سے زیادہ زندگی بیت گئی۔ اب نئی نوکری ملنا محال ادھر دیا دھرم کا اکال۔ نہ گھر میں پوچھ نہ سرکار میں سنوائی۔ پریشانی۔ گھبراہٹ۔ تلملاہٹ۔ زندگی اجیرن ہو گئی۔

نارنگ اپنی کہے جاتا۔ پتہ نہیں اسے کون سی چیز چھن جانے کا ڈر تھا۔ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی کچھ کھو جاتا رہتا۔ مٹھی نہ کھولتا۔ سنبھالتا چلا جاتا۔

یو۔ این۔ او۔ ڈے منا رہے تھے ہم۔ نارنگ بولنے لگا:

"یو۔ این۔ او۔ ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعہ امریکہ جیسے امیر دیش غریب دیشوں کی مدد کرتے ہیں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ غریب دیش امیر دیشوں کے وفادار رہیں۔ ان کی حامی بھرتے رہیں۔ وقت پڑنے پر ان کا ساتھ دیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے تو امیر دیش ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔

یو۔ این۔ او کی تعریف میں کہے گئے الفاظ ہم سب سن کر کڑھتے رہے کیسے یقین دلائیں ہم اسکول کے وفادار رہیں۔ پرنسپل کے وفادار رہیں پربندھک کے وفادار رہیں۔

ایک دن حد ہو گئی پرنسپل نارنگ دھاڑنے لگا:

"لوگ مندر جاتے ہیں۔ چند منٹ بھگوان کا نام لیتے ہیں تھوڑا سا پرشاد چڑھاتے ہیں۔ اسی وقت مراد بر آنے کی کامنا کرنے لگتے ہیں۔ مراد بر نہیں آتی بھگوان کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔

پرنسپل رکا۔ ہماری طرف دیکھنے لگا:

"بھگوان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کی شکتی اپار ہے ...... اس نے سینہ پھلایا۔ اس دن ہماری نراشا کا ٹھکانہ نہ تھا۔ ہم پتہ نہیں کیا کیا بولتے رہے۔ اس دن نرپت نہ مسکرایا نہ ہنسا۔ ہمارے چہروں کو پڑھتے ہوئے اس نے آنکھیں نہیں جھپکائیں۔ اس کے چہرے کو پڑھنے کی ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ تھا بھی کیا!

دیکھتے ہی دیکھتے پرنسپل نے بچوں کو ان کی چھوٹی موٹی شرارتوں کے لیے سزا دینی شروع کر دی۔ جھڑکیوں کے بعد تھپڑ اور جلدی ہی۔ بعد ڈنڈے کی مار۔ بچے مار کھاتے رہتے۔ نارنگ

ہماری طرف دیکھتا ہوا اپنا نچلا ہونٹ کاٹتا رہتا۔

عجیب صبح تھی۔ اُجلی اور بھیانک۔ اساڑھ کا مہینہ۔ آسمان خالی۔ سورج جھلس کر رکھ دینے پر تُلا ہوا۔ ہوا بند۔ پتّہ تک نہ ہلتا۔ اُس سے پہلے دن نارنگ نے سٹیج کو لال اور کالی لکیروں کے روغن سے سجوایا تھا اسکول کے لیے مائکروفون منگوایا تھا۔ اپنے لیے نئی بیت بھی خریدی تھی۔

پرارتھنا ختم ہوتے ہی پرنسپل ڈسپلن کی تشریح کرنے لگا:

"ڈسپلن کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ جو بچّے میری بات نہیں سمجھتے۔ مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے اُنھیں اپنی بات سمجھا کر دم لوں گا۔"

وہ ہٹلر اور ٹوجو کی مثال دینے لگا:

"ہٹلر جرمنی کا تاناشاہ۔ دوسرا مہایدھ شروع کرنے والا۔ جاپان اور اٹلی کے ساتھ اُس کا گٹھ بندھن۔"

وہ عادت کے مطابق ہماری طرف مُڑا:

"کوئی آدمی یوں ہی بڑا نہیں بن جاتا۔ کوئی نہ کوئی گن اس میں ہوتا ہے جو اُسے دوسروں پر حق جمانے کے قابل بناتا ہے۔"

وہ ودیارتھیوں کو بتانے لگا:

"ہٹلر جاپان کے جنرل ٹوجو کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھا یدھ نیتی پر وچار کر رہا تھا۔ بات ڈسپلن پر آگئی۔ دونوں آخری منزل کی چھت پر چلے گئے۔ انھوں نے اپنی اپنی فوج کے دس دس جوان بُلائے۔ اُن کے لائن میں کھڑے ہوتے ہی ٹوجو نے اپنی ٹکڑی کو مارچ کرنے کا حکم دیا۔ جوان چلنے لگے۔ چھت کی منڈیر پر پہنچ کر رک گئے۔ اُنھوں نے ٹوجو کی طرف دیکھا۔ ٹوجو کے اشارہ کرتے ہی وہ ایک ایک کر کے چھت پر سے نیچے سڑک پر کودنے لگے۔ ساتویں منزل سے گر کر مرنے لگے۔ ٹوجو نے ہٹلر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں فخر تھا۔ ہٹلر مسکرایا۔ اُس نے اپنے جوانوں کو مارچ کرنے کا حکم دیا۔ جوان چلتے گئے۔ منڈیر پار کر کے موت کے منہ میں اُترتے گئے۔ اُنھوں نے ہٹلر کے اشارے کا انتظار نہیں کیا۔ ٹوجو کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔"

نارنگ بولتا رہا۔ ہم ڈولتے رہے۔ ہمارے سامنے ہٹلر کا اپنی بیوی کے ساتھ خودکشی

کا منظر گھوم گیا۔ ٹوجو نے بھی یدھ ہارنے کے بعد اپنے کو گولی مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ لاکھوں لوگوں کے قاتل۔ انسانیت کے ہتیارے اپنے کو منوانے کے لیے پاگل۔ ہم اٹلی کے تاناشاہ میسولینی کو یاد کرنے لگے۔ بات بات میں کہتا — میرا لفظ، میری طاقت، میرا حکم، میں! میں!

یدھ ختم ہوتے ہی اُس کے اپنے لوگوں نے اس ظالم کی ہتیا کر دی۔ اُسے بچ کر بھاگنے نہیں دیا۔ اُس کی لاش کو راجدھانی کے چوراہے میں اُلٹا لٹکا دیا۔ لوگ اُس پر تھوکتے رہے۔ کُتّے اُسے نوچتے رہے۔ ذلیل کرتے رہے۔

یاد تو ہمیں چین کے مہاراجہ کی بھی آئی۔ بے رحم ہر شام شراب کا جام لے کر بیٹھ جاتا۔ سامنے کڑاہے میں تیل اُبلتا رہتا۔ سپاہی ہر روز ایک نہ ایک نوجوان کو پکڑ لاتے۔ مہاراجہ نوجوان کو کڑاہے میں پھینکے جانے کی سزا سناتا اُس کا جُرم نہ بتاتا۔ آخری جام تک وہ نوجوان کے چہرے کو دیکھتا رہتا۔ قہقہے لگاتا رہتا۔ آخری جام ختم ہونے سے ذرا پہلے اُسے اُبلتے تیل میں پھنکوا دیتا اور ناچنے لگتا۔ اُس کے بوڑھے وزیر سے دیکھا نہ جاتا یہ کھیل ایک دن اُس نے ہمّت کر کے مہاراجہ کو کھیل بند کرنے کی صلاح دی۔ مہاراجہ غصّے سے پاگل ہو اُٹھا۔ شراب کا پیالہ وزیر کے مُنہ پر مار کر اس نے بوڑھے شریر کو اپنے ہاتھوں سے اُٹھایا اور تیل میں پھینک دیا۔ اُس دن کے بعد اُس کا چین جاتا رہا۔ جگہ جگہ گھومتا ہوا وہ اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔

ہم سوچ ہی سکتے تھے۔ کچھ کر نہ سکتے تھے...... وزیر کا پارٹ ادا کرنے کی ہمّت کسی میں نہ تھی۔

اُدھر نارنگ دہاڑے جاتا تھا:

"تم ہل رہے ہو۔ ہنس رہے ہو۔ بات کر رہے ہو۔

"خبردار جو کسی کے سانس لینے کی بھی آواز آئی......!"

پرنسپل نے ایک لڑکے کو بُلا کر اُسے ڈانٹ پلائی۔

دوسرے لڑکے کو بُلا کر تھپّڑ مارے۔

تیسرے کی بیت سے پٹائی کی۔ بیت کی چوٹ کی آواز اسکول میں گونجے یہ سوچ کر اس نے لڑکے کا ہاتھ ماتھے تک اونچا اُٹھایا۔

"میں کچھ بھی برداشت نہیں کروں گا۔ میں بدلہ لینے کی بھاونا سے بھرا ہوا ہوں۔ اپنے اور پرائے کو پہچانتا ہوں۔ معافی نام کا لفظ میری ڈکشنری میں نہیں جس نے جیسا کیا ہے ویسا بھرے گا......" کیسے کیسے جملے کانوں میں گونجتے رہے۔ تکے، بے تکے۔

پرنسپل نے ایک اور ودیارتھی کو سٹیج پر بلایا:

"تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ مسکرانا بند نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا۔ میں نافرمانی برداشت نہیں کر سکتا۔"

پرنسپل نے لڑکے کو مرغا بن جانے کو کہا:

"یہ بدذات لڑکا مرغا بنے بنے ہی پوری گراؤنڈ کا چکر لگائے گا۔"

پرنسپل نے نگاہیں ہماری طرف گھمائیں اور کچھ سوچنے لگا:

"میں شری نربت سے درخواست کرتا ہوں وہ سٹیج پر آ جائیں۔ اس گستاخ لڑکے کے ساتھ ساتھ چلیں۔ وہ دیکھیں یہ شرارتی لڑکا تمام راستہ اپنے کان پکڑے رہے کہیں رکے نہیں۔"

ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ نربت کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ پل بھر کو سپید پڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے میں لوٹ آیا۔ گردن نیچی کئے چلتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔

دُور دُور تک سناٹا تھا۔

پرنسپل تنا ہوا تھا۔

ہم سہمے ہوئے تھے۔

بچوں کا دم سوکھ گیا تھا۔

نربت نے معصوم نظروں سے سب کو دیکھا۔

دوسرے ہی پل وہ جھکا اور اُس نے لڑکے کو کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اُس کی نگاہوں میں جھانکنے کے بعد اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"شری نربت!" پرنسپل نے پکارا۔

نربت پرنسپل کی آواز کو اَن سنا کر کے بچوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"شری نربت!" پرنسپل ہکلایا۔

نرپت گمبھیر ہو گیا۔ ایک نظر پرنسپل پر ڈال کر اُس نے نگاہیں ہماری طرف پھیر دیں:

"پرنسپل نارنگ!" نرپت کا بازو اوپر کو اٹھ گیا۔

"مردہ باد!" ہماری آواز میں بچوں کی آواز بھی شامل تھی۔

نرپت لڑکے کو پچکارتا ہوا اسٹیج سے نیچے اُترنے لگا۔

اُس دن اسکول میں چھٹی رہی۔

نیلا تھوتھا پیسنے والا

آج پھر وہ باہر کھڑا کوں کوں کر رہا ہے۔ دروازے پر پنجے مار رہا ہے۔ تھوتھنی رگڑ رہا ہے۔

اُس دن گڈھیلے اُسے نیلا تھوتھا کھلانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ زنجیر سے بندھا تڑپ رہا تھا۔ عجیب سی آوازیں رو رہا تھا۔

گڈھیلوں کا سردار مٹی کے پینڈے اور دھجیوں سے منڈھے نیچے والے حقے کو گڑگڑاتے ہوئے اسے نفرت سے گھور رہا تھا۔ اس کے پاس بیٹھا آدمی نیلا تھوتھا پیس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بیزاری تھی۔

ہر سال گڈھیلوں کا قافلہ برسات کے بعد شہر کے باہر اُترتا۔ برساتی نالے کے کنارے نالے کے گرد پھیلی ہری گھاس سردار کے گھوڑے کے ہی نہیں گدھوں کے بھی کام آتی۔ میں ہر شام نالے کے اُس پار تک سیر کو جاتا۔ دُور تک لبی چیتھڑے کے تمبوؤں کی میلی سی بستی کو دیکھتا۔ وہاں پہنچتے ہی میری چال دھیمی پڑ جاتی۔ میلے کچیلے، پھٹے پرانے بدرنگ کپڑوں والے لوگوں کے بے رونق چہروں اور بجھی نگاہوں کی کہانی پڑھتا۔ وہ اپنے کام میں جُتے رہتے۔ کوئی گھوڑے کو پیڑ سے باندھ رہا ہوتا، کوئی گدھوں کو سنبھالتا۔ عورتیں رات کا کھانا پکانے میں جُتی رہتیں۔ چولہوں پر ہانڈیوں میں پکتے گرم مسالے میں بسے شکار کی بُو دُور تک پھیل جاتی۔

گڈھیلوں کا سردار مجھے سلام کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھاتا اور منہ سے نلی نکال کر بڑبڑاتا۔ بچوں کی ہنکان آواز کا کفن اوڑھ لیتی۔

جو چیز میرا دھیان کھینچتی، وہ کالے رنگ کا مضبوط کاٹھی والا کتا تھا۔ آنکھیں جتنی پیلی اتنی بھیانک، گھٹا ہوا سر۔ بھاری تھوتھنی، لپکتی زبان اور خونخوار جبڑے بستی کے چاروں طرف بھاگتا ہوا وہ بڑا خوش نظر آتا۔ گدھوں اور گھوڑے کے پاس رُک کر ان پر بھونکتا۔ مرغیوں کے پیچھے بھاگتا۔ کبھی بھیڑوں پر لپکتا۔ تھک جاتا تو سردار کے قدموں میں لوٹنے لگتا۔ سردار اس کے آگے بوٹیاں ڈال دیتا اور اُسے ہڈی چباتے دیکھ کر مسکراتا رہتا۔

اُس شام کُتے کو زنجیر سے بندھا دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ وہ چھٹپٹا رہا تھا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ ماتمی آواز میں رو رہا تھا جیسے اس نے خطرے کی بُو سونگھ لی ہو۔

مجھے رُکتے دیکھ کر سردار نے حقہ چھوڑ دیا اور زمین پر پڑا کپڑا بچھا کر مجھے بیٹھنے کو کہا۔

"اسے کیوں باندھ رکھا ہے؟" میں نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

میری بات کا جواب دیئے بغیر سردار کے ہاتھ چلم کی طرف بڑھے۔ چلم بُجھ چکی تھی۔ اس میں بس راکھ ہی راکھ تھی۔

نیلا تھوتھا پینے والا پتھر گھستا رہا۔ کُتے کی گُھٹی ہوئی چیخ ماحول کو بھیانک بناتی رہی۔

"تم نے تو اسے پالا ہے۔ اتنا سا تھا جب میں نے اسے پہلی بار تمہارے ساتھ دیکھا۔"

سردار اب بھی چُپ رہا۔

"اب یہ تمہارے لیے وردان ہے۔ ایسا کُتا شیر کا مقابلہ کرتا ہے۔ شکار میں مدد دیتا ہے۔ سنکٹ میں سہارا کرتا ہے۔ بستی کی حفاظت سے بھی مُنہ نہیں موڑتا۔"

یہ سُن کر سردار تڑپ اُٹھا۔ اس نے کُتے کی طرف نظر دوڑائی۔ پیڑوں کے پاس صرف گدھے نظر آرہے تھے گھوڑا غائب۔ میں نے پوچھا۔

"یہ گھوڑا کہاں گیا؟"

سردار نے اپنے کو سنبھالا چلم میں تمباکو ڈالا اور انگارے بھر کر حقے پر رکھا:

"جانور سے اتنا موہ بھی اچھا نہیں بابو۔"

وہ نیلا تھوتھلا پینے والے پر جھنجھلایا۔

"جلدی کرو۔ رات ہو گئی۔ اتنی دیر میں تو....."

"کیا تم نے اسے مار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا؟" میں کانپ اُٹھا۔ "اگر اسے میں لے جاؤں۔"

"پونچھ سے آگے پیٹھ پر اسے کھُجلی کا روگ ہو گیا" سردار داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"علاج سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنی سی بات کے لیے اس کی جان لے لینا ٹھیک نہیں۔"

"میں نے بتا دیا۔ آگے تم جانو" سردار حقہ گڑگڑانے لگا۔

نیلا تھوتھا پینے والے کے ہاتھ رُک گئے۔ وہ اُٹھا اور اس نے کتے کی زنجیر میرے ہاتھ میں تھما دی۔

تمام راستہ کالو میرے پانو چومتا رہا۔ مجھے مشکور نظروں سے دیکھتا رہا۔

میں گھر پہنچا تو شانتا کالو کو دیکھ کر چلا اُٹھی۔

"اسے کہاں سے اُٹھا لائے؟"

"گڈھیلوں کے سردار سے لایا ہوں۔"

"یہ تو گدی کتا ہے۔ مالک کو کیسے چھوڑ آیا؟"

"گڈھیلا سردار اسے نیلا تھوتھا کھلا کر مار ڈالتا۔"

"گدی کتا موت سے نہیں ڈرتا۔ یہ مالک کو کیسے چھوڑ آیا؟"

کالو شانتا کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ شانتا اُسے گھورنے لگی۔

"دیکھو آتے ہی تمھارے ساتھ ہل گیا" میں نے ہمت باندھی۔

میری بات کو اَن سُنا کر کے شانتا نے اپنی نظر کالو کی پیٹھ پر جما دی "اسے تو کھُجلی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ علاج سے ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اسے واپس چھوڑ آؤ۔ یہ گدی کُتا....."

تبھی راجو اور دِٹّو نے آگے آکر کالو کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ کُتا اُن سے لاڈ جتانے لگا تو میں نے اسے گیراج کے دروازے پر باندھ دیا۔

شانتا سب کچھ بھول کر کالو کی دیکھ ریکھ کرتی رہی۔ اسے دودھ پلاتی رہی۔ ماس کھلاتی رہی اور راجو و ٹِو کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ لیکن جب کالو کو کبھی سے چھٹکارا مل گیا تو وہ چونکی۔

"یہ عجیب کُتا ہے۔ دن رات بندھا رہنے میں خوش رہتا ہے۔ صبح شام ہی اُچھلتا کودتا ہے۔"

وہ مجھے خاموش دیکھ کر آگے بولی۔

"اس کا کام رات کو جاگنا اور کوٹھی کی رکھوالی کرنا ہے ورنہ یہ چور چکار کو....."

"ہم آج رات اسے کھلا چھوڑ دیں گے۔" مَیں نے سمجھا دیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اسے باندھنا نہیں چاہیئے۔ یہ گدی کُتا ہے۔ اپنے خون کو نہیں جھٹلا سکتا۔"

"تم بھی خوب ہو۔ اسے گدی نسل کا بھی بتلاتی ہو اور اس میں عیب بھی نکالتی ہو۔"

شانتا خاموش ہو گئی۔ اُس رات میں نے کالو کو زنجیر سے نہیں باندھا۔ اسی رات گھر میں چوری ہو گئی۔ صبح اُٹھ کر ہم نے دیکھا۔ رسوئی کے برتن اور آنگن میں پڑا سامان غائب۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔

"کالو کہاں ہے؟" شانتا چلائی۔ وہ ڈیوڑھی سے باہر بھاگی۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔

کُتا گیراج کے پاس زنجیر کے سرے پر منہ رکھے لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اُٹھا اور کوٹھی میں اِدھر اُدھر بھاگتا ہوا زور زور سے بھونکنے لگا۔ میں نے اسے اس طرح بھونکتے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

شانتا کے غصے کا ٹھکانہ نہ رہا۔

"اب بھونکنے سے کیا ہوتا ہے؟ وقت پر کیوں چپ رہا؟ میں نہ کہتی تھی یہ کتا ہمارے لیے اشبھ ہے۔ اسے گھر میں نہ رکھو۔ خرچ الگ بڑھا۔ بچوں کا وقت الگ برباد ہوا۔ وہ پڑھائی

چھوڑ کر دن بھر.....“

بیوی بولتی رہی اور میں اپنے کیے پر نادم۔

بہت سوچ کر میں نے اُسے دلاسا دیا۔

”ہو سکتا ہے چور نے اسے کچھ کھلا دیا ہو۔“

”گدی کُتا چور کے ہاتھ کا کھائے گا؟“ شانتا جھنجھلائی اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

شام کو دفتر سے لوٹا تو بچے اُداس تھے۔

کالو دوپہر سے غائب تھا۔ شانتا نے اسے جھڑک دیا اور وہ گھر سے چلا گیا۔

بیوی کی آنکھوں میں غصّہ اور نفرت دیکھ کر مجھے کُتے کی وکالت کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ لیکن میں اسے بھولا نہیں۔

ایک دن راجو بھاگا بھاگا گھر آیا۔

”ڈیڈی! کالو مل گیا۔“

”کہاں؟“

ڈیڈی! میں نے اس کو قرول باغ کے چوک میں دوسرے کُتوں کے بیچ حلوائی کی دُکان پر دیکھا۔“

”اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

”مَیں نے اسے بہت پکارا اور پچکارا لیکن اس نے میری ایک نہ سُنی۔“

”وہ بازاری کُتوں کے ساتھ گھوم رہا تھا؟“ شانتا اُبل پڑی ”وہ حلوائی کی جھوٹن کھا رہا تھا؛ میں جانتی تھی کالو گدی کُتا نہیں ہو سکتا۔“ شانتا نے ماتھا پکڑ لیا۔

”ڈیڈی! ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کالو کو لے آئیں گے۔“ راجو اور دکو میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگے۔

میں نے بچّوں کا کہا نہیں مانا۔

ہم کالو کو بھول گئے۔ گھر میں کسی کی زبان پر اس کا نام نہ آیا۔ میں سوچتا ”یہ اتنا ہی کافی ہے میں نے اس کی جان بچائی۔“

ایک دن رات کے دوسرے پہر میرے کمرے کے باہر سے کوں کوں کی آواز

آنے لگی۔ وہ دروازے پر تھوتھنی گھسانے لگا۔ بار بار پنجے مارنے لگا۔

مَیں نے دھیان سے سُنا یہ کالو کی آواز تھی۔ مجھے یاد تھا اس دن سردار کے سامنے پیڑ سے بندھا وہ اسی طرح رو رہا تھا۔ وہی ماتمی دُھن جیسے اسے اپنی موت دکھائی دے رہی ہو۔

مَیں نے دروازہ کھول دیا۔ کتا جھٹ سے اندر آ کر میرے پانو میں بچھ گیا۔ شانتا بھی جاگ اُٹھی۔ کالو دُم ہلاتا ہوا اس کے آگے جا لیٹا۔

"اسے اپنی بھول کا پتہ چل گیا۔ اب اسے یہیں رہنے دو۔" میرے دل میں کالو کے لیے سویا ہوا پیار جاگ اُٹھا۔

"دیکھتے نہیں؟" بیوی نے اشارہ کیا۔ "اب اس کو کھجلی پیٹھ کے بیچ شروع ہو گئی۔ چکتہ پہلے سے بڑا بھی ہے اور گہرا بھی۔ مَیں اب اسے گھر میں نہیں رکھوں گی۔"

اتنے میں راجو اور رونو بھی جاگ اُٹھے۔ وہ اپنے کو رو رو کر ہلکان کرنے لگے۔ کالو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے پچکارنے لگے۔

"ہم تو روز اسے دیکھنے بازار جاتے رہے۔" رونو سسکنے لگا۔ "ہم اسے نہیں جانے دیں گے۔"

بیوی کو ہار ماننی پڑی۔

پھر وہی دوا دارو۔ دودھ اور ماس بچوں کا لاڈ پیار۔ کالو کا وہی سبھاؤ۔ دن بھر زنجیر سے بندھا پڑا رہتا۔ صبح شام بھاگتا ہوا بھونکتا اور غراتا۔

جب اُس کی کھجلی دُور ہو گئی تو شانتا نے سجھا دیا۔

"اسے گڈھیلوں کو واپس کر آؤ۔"

"اب گڈھیلے کہاں۔ وہ اگلے برس آئیں گے۔ برسات کے بعد۔" مَیں نے سُکھ کا سانس لیا۔ "اب اسے کچھ نہ کہنا۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔ پہلے میں اسے لایا تھا۔ اب یہ خود یہاں آیا ہے۔"

دوسرے دن دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر آیا تو حیران رہ گیا۔ بازاری کتے کوٹھی کے باہر کھڑے کالو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کالو بھی انھیں دیکھ کر کسمسا رہا تھا۔

"کہیں یہ پھر نہ بھاگ جائے۔" مجھے شانتا کا خیال آیا اور مَیں اندر تک کانپ

اُٹھا۔

میں نے کالو کو آواز دی۔ ۰۰ وہ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور اگلے پنجے میری چھاتی پر رکھ کر پیار جتانے لگا۔ پھر وہ بھونکتا ہوا کتوں کی طرف لپکا اور انہیں دُور تک چھوڑ آیا۔ اس بار میں نے سُکھ کی سانس لی۔

"اسے سمجھ آگئی۔ مالک کو پہچاننے لگا۔ ہمدردی کو ماننے لگا۔ یہ تو جانور ہے انسان بھی ٹھوکر کھائے بغیر کچھ نہیں سیکھتا" میرے من نے کہا "انسان تو کسی بھی طرح کچھ نہیں سیکھتا" ۔

اسی شام دفتر سے لوٹا تو راجو اور ونٹو میرے ساتھ آ لپٹے۔

"ڈیڈی کالو پھر بھاگ گیا"

"کیا کہا؟" میں نے شانتا کی طرف دیکھا۔

"میں نے نہیں بھگایا" وہ تن گئی۔

"ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ کالو ہمارے ساتھ کھیل رہا تھا کہ باہر سڑک پر آوارہ کتے آگئے۔ ہمیں چھوڑ کر وہ ان کے ساتھ بھاگ گیا" بچے تڑپ اُٹھے۔

"میں پھر کہتی ہوں جو گڈھیلوں کا نہ ہو سکا ہمارا کیسے ہوتا" شانتا نے گیان بگھارا "ایک تو کتا وہ بھی گیا گزرا"

اُس کی بات سُن کر مجھے گڈھیلوں کا گھوڑا یاد آگیا۔ وہ اُس شام نہ اپنے تھان پر تھا نہ کہیں آس پاس۔ پچھلے دنوں ان کی دو بکریاں اور ایک بھیڑ بھی کم ہو گئی تھی۔ کچھ مرغیاں بھی غائب۔ میرا وچار تھا وہ گڈھیلوں کے پیٹ میں چلی گئیں۔ لیکن گھوڑا؟ سردار کی انگارے برساتی نگاہیں میرے سامنے اُبھرنے لگیں۔

"بابو۔ جانور سے زیادہ پیار کرنا ٹھیک نہیں"

میں نے کالو کو بھلانے کا فیصلہ کر لیا۔

آج پھر باہر کھڑا وہ کُوں کُوں کر رہا ہے۔ دروازے پر تھوتھنی رگڑ رہا ہے۔ اسے پنجوں سے کرید رہا ہے۔

آج کی برساتی رات۔ آکاش پر چھائی گھنگھور گھٹائیں۔ بار بار بجلی چمک اُٹھتی ہے۔

وہ کُوں کُوں کیے جاتا ہے۔

آج میری بیوی مجھ سے پہلے جاگ گئی۔

"اب اسے اندر نہ آنے دینا۔ اس بار کھجلی اس کے سر سے شروع ہو گئی۔ سر پر کھجلی والا کتا سنکٹ کی نشانی۔ آپ بچتا ہے نہ مالک کو بچار ہنے دیتا ہے۔ تم اسے ....."

میں نے شانتا کو سننا بند کر دیا ہے۔ کالو کی کوں کوں بھی مجھ تک نہیں پہنچ رہی۔ میرے سامنے گڈ میلوں کا سردار حقے سے بجھی ہوئی چلم اتار رہا ہے۔ اس میں بس راکھ ہی راکھ ہے۔ اور بغل میں بیٹھا بے زار ننگا ہوں والا آدمی نیلا تھوتھا پینے میں مصروف۔

کھلاڑی

بات کل کی نہیں پرانی ہے

برسوں پہلے میں نے اسے کافی ہاؤس میں دیکھا تھا۔

ہمارے ساتھ بیٹھا ہونے پر بھی ہمیں نظر نہ آنے والا۔

اس دن وہ برداشت نہ کر سکا۔

اس دن وہ سوال بن بیٹھا اور جواب بھی۔

کافی کی آخری چسکی لے کر اس نے ہمارے چہروں پر نظریں گھمائیں۔ آخر میں اس نے کالے کلوٹے موٹے چشمے اور درمیانہ قد والے ہمارے ساتھی کو گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔

"کب تک مجھے نظر انداز کرتے رہو گے؟" وہ رکا نہیں "تم سب سے زیادہ جانتے ہو اور تمھیں ہی معلوم نہیں"

موسم پہلے ہی بے کیف تھا۔ اب گھٹن اور بڑھ گئی۔ ہم چاہتے تھے لیکن اٹھ نہ سکے۔

وہ چاہتا تھا اور بولتا چلا گیا۔

ہمیں پتہ نہ چلا کب پنکھا بند ہو گیا۔ ہم تو بس اسے سننے میں لگے تھے۔

آج بھی ہوا بند ہے۔ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ آج بھی وہ بول رہا ہے۔ پہلے کی طرح آج وہ نظر نہیں آ رہا۔ نہ میں کافی ٹیبل پہ ہوں۔ نہ میرے ساتھ کالا کلوٹا درمیانے قد والا میرا دوست ہے۔ میں اکیلا ہی اس کی آواز سن رہا ہوں۔ کان بند کرنے سے فائدہ؟ وہ

کہیں آس پاس سے نہیں بول رہا۔ وہ تو موسم کی طرح بے قابو ہے۔ اپنی رو میں بہنے والا۔ اپنی سُنانے پر تُلا ہوا۔ اندر باہر کہیں سے بھی۔

گلی کی نکڑ پر بستی ختم ہو جاتی ہے۔
نکڑ پر پہنچ کر مُنیرا بھی رک لیتی ہے۔
نکڑ کے آگے کھیت۔ جوتا جتایا، بویا بوایا۔ کیاریوں میں بٹا کھاد سے بھرا ہوا لیکن ہریالی سے خالی۔

مجھے بے زار دیکھ کر وہ آگے بولنے لگا۔
مُنیرا کھیت کی منڈیر پر بیٹھے سوکھی ٹانگوں، مرجھائے بازوؤں اور چھدری داڑھی والے مریل کسان کو دیکھنے لگتی۔
بوڑھا کھیت کی بنجر کوکھ میں پڑے بیجوں کو گھورتا رہتا۔ پہلو میں پڑی تازہ ترکاریوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ آہیں بھرتا رہتا۔
ترکاریاں وہ دوسروں کے کھیت سے لاتا۔
کسان اور کھیت کو دیکھ کر مُنیرا کے دل میں ہوک اُٹھتی۔ وہ بُگھی کی طرف پلٹتی اور......

مُنیرا! پانچ بھائیوں کی اکیلی بہن۔ جمنا کی مانگ مُراد۔
بڑے بیٹے کے بعد جمنا مُنیرا کا ہی جنم مناتی۔ کیرتن کراتی۔ پرساد بانٹتی۔
دیکھتے ہی دیکھتے مُنیرا کی کوکھ ہری ہو جاتی ہے۔ جمنا چونک پڑتی۔ اس کے کان کھڑے ہو جاتے —— نانی ماں! نانی ماں! —— وہ مُنیرا کا مُنہ ہاتھوں میں لے کر چوم لیتی۔ ڈھیر ساری دُعائیں دے ڈالتی۔ اسے نانی بننے کا شوق تھا۔

کوئی وقت تھا میں مُنیرا کی کہانی سُن کر اوب جاتا۔ اسے چُپ ہو جانے کو کہتا۔ وہ خفا ہو کر ٹہلنے لگتا یا کہیں چلنے کی تیاری کرنا شروع کر دیتا۔ اب یہ بات نہیں۔ اب وہ سُناتا ہے، میں سنتا ہوں۔ وہ نہ بھی سُنائے تو بھی سُنتا ہوں۔ اپنے کو جانتے اور گالے کلوٹے بے لگام

دوست کو پہچاننے کے لیے۔

جمنا کا ماتھا اس وقت ٹھنکا جب مُنیرا کی سہیلیوں پر بہار آنی شروع ہوئی۔ دُلاری کے سینے پر نارنگیاں پھوٹنے لگیں۔ رُکمنی کا شریر جوبن کی گندھ دینے لگا۔ تارو بھی جسم چُرانے لگی۔ شیلو کی آنکھوں میں حیا اور توشی کی آنکھوں میں نسائیت کی کچّی چھایا جھلکنے لگی۔ ادھر مُنیرا! سپاٹ چھاتی۔ خالی چہرہ، بے رنگ آنکھیں۔ کچھ بھی کام کا نہیں۔

جمنا بھنّا اُٹھی۔

"یہ لڑکی جوان کب ہوگی؟"

پندرہ کا سن پار کرتے ہی مُنیرا ماں پر بھوت کی طرح سوار ہوگئی۔ اسی سال رُکمنی کی شادی ہوئی تو جمنا سے رہا نہ گیا۔ اڑوس پڑوس کی نظروں کو دیکھتی پڑھتی ہوئی وہ بیٹی کو گوکل وئید کے پاس لے گئی۔ گوکل نے مُنیرا کی نبض دیکھی اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پاس پڑی شیشی اُٹھائی اس میں پڑے سفوف کی پُڑیا باندھنے لگا۔

"ایشور نے چاہا تو لڑکی جلد ہی ہاتھ پاؤں نکالنے لگے گی۔"

تین مہینے دوائی کھانے پر بھی مُنیرا نے اپنا آپ دکھانا شروع نہ کیا تو جمنا پھر گوکل کے پاس پہنچی۔ وئید نے دوائی نہ بدلی۔ میعاد ضرور بڑھادی۔

"ہر بات ہونے کے لیے وقت مانگتی ہے۔ نراش ہونے کی بجائے انتظار کرنا سیکھو۔"

گوکل نے جھوٹ نہ کہا تھا۔ پانچویں مہینے مُنیرا کا جسم زاویے بنانے لگا۔ گولائیاں بھی اُبھرنے لگیں۔ آنکھوں میں بھی کچھ عجیب سا جھلکنے لگا۔ چھٹا مہینہ پورا ہونے کو تھا کہ اس کے پیٹ میں درد اُٹھا۔ جمنا رات بھر پرارتھنا کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہی اس نے بیٹی کی شلوار کا آسن دیکھا اور خوشی سے چلّا اُٹھی۔ آسن لال ہوگیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس نے خون میں سنی دو چھوٹی چھوٹی گدریاں محلّے کے چبوترے پر بیٹھی عورتوں کے بیچ پھینک دیں اور مسکرانے لگی۔

رات بھر پڑوسنیں جمنا کو بدھائی دیتی رہیں۔ گیت گاتی رہیں۔ موج اُڑاتی رہیں۔

چوتھے دن سے مُنیرا بجرنگ بَلی کے مندر جانے لگی ہنومان چالیسہ کا پاٹھ کرنے لگی منگلوار کا برت اُس کا اُصول بن گیا۔ وہ گھر گھر جا کر پرساد بانٹنا بھی نہ بھولتی۔

جمنا نے بیٹی کا رنگ روپ نکھرتے دیکھا تو اسے داماد ڈھونڈھنے کی فکر ہوئی۔ اس کی مراد پوری ہونے میں دیر نہ لگی۔ ساتھ والے محلے کا رگھو سہرا باندھ کر آیا اور مُنیرا کو ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔

بیٹی کو سسرال بھیج کر جمنا نواسے کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ پوتے پوتیوں کے جھنڈ میں نواسے کی کمی اسے بڑی طرح کھلتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رگھو اور مُنیرا کی جوڑی گھومتی رہتی۔ کئی بار اسے لگتا اس کا نواسا رگھو کی اُنگلی پکڑے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا اسے ملنے آرہا ہے۔ جب بھی مُنیرا مائیکے آتی جمنا اس کے پیٹ پر نظریں جما دیتی اور اس کی آنکھوں میں کچھ کھوجتی رہتی۔

دو سال بیتنے پر بھی مُنیرا کی گود ہری ہونے کی کوئی نشانی نظر نہ آئی تو جمنا کی جان پر بن گئی۔ اسے کئے کرائے پر پانی پھرتا دکھائی دینے لگا۔ ایک بار پھر وہ اسے، گوکل وید کے پاس لے گئی۔ اس بار گوکل چونکا۔ اس نے مُنیرا کو چت لٹا کر اپنی انگلیوں سے اس کا پیٹ بجایا دیر تک اپنے میں ڈوبا رہنے کے بعد وہ بولا:

"بی بی! مَیں لڑکی کو عورت بنا سکتا ہوں عورت کو ماں نہیں بنا سکتا۔ دودھ پُوت ایشور کی دین یا کرموں کا پھل ہے۔ دوا دارو کا آسرا لینے کی بجائے کسی سادھو سنت کے چرن پکڑ۔ اس کے آشیرواد سے......"

جمنا نے گوکل کی بات پلے باندھ لی۔ اسی شام وہ مُنیرا کو لے کر شہر کے باہر برگد کے نیچے آسن جمائے، دھونی رمائے بیٹھے سادھو کے پاس جا پہنچی۔ سادھو نے اس کی پکار سن کر آنکھیں کھولیں۔ جے بھولے ناتھ۔ جے شو شنکر، کی ہانک لگائی۔ چٹکی بھر راکھ مُنیرا کے ہاتھ میں تھمائی۔ اسے شو مندر کی راہ بتائی۔ انت میں ایک بات اسے کان میں سمجھائی اور اپنے میں ڈوب گیا۔

مُنیرا رات دن شوجی کی اُپاسنا کرنے لگی۔ صبح شام مندر جاتی۔ بل پتر اور پانی کا گڑا چڑھاتی۔ مندر کی صفائی کرتی۔ اس کا چبوترہ اور سیڑھیاں دھوتی۔ کبھی کبھار چوری چھپے رات کے اندھیرے میں اپنے کو شو لنگ کے ارپن بھی کرآتی۔ لیکن اس کی

مُراد نہ بر آئی ۔

جمنا کی اُداسی کا ٹھکانہ نہ تھا ۔ گوکل نے جواب دیدیا سادھو کا آشیرواد بے کار۔ بوکھلا کر وہ مُنیرا کی ساس پر چڑھ دوڑی ۔ سمدھن نے اُلٹ کر جواب دیا تو داماد میں عیب ڈھونڈنے لگی ۔ ہوتے کرتے وہ اس کا ڈاکٹری معائنہ کرانے پر تُل گئی ۔ اس نے سوچا ڈاکٹر داماد میں نقص نکال دے اور وہ بیٹی کی شادی کہیں اور کر دے ۔ اس جوڑی سے نواسہ ملنے سے رہا ۔

داماد ڈاکٹری معائنے میں پورا اترا ۔ آخری اُمید کے ساتھ جمنا نے بھی دم توڑ دیا ۔ لیکن بیٹی سے کہہ گئی کہ بچہ ضرور جنے ۔ بچہ جنے بغیر عورت ماں نہیں کہلاتی ۔ سیدھی نرک میں جاتی ہے یگوں چڑیل بنی بھٹکتی ہے .....

ماں کے جانے کے بعد جلد ہی مُنیرا کے ساس سسر اپنے اکلوتے بیٹے کو بہو کے رحم پر چھوڑ کر پرلوک سدھار گئے ۔ اب مُنیرا آزاد تھی ۔ رگھو کو ایک طرف کر کے وہ محلے کے گبروؤں کی طرف لپکی ۔ ایک ایک کر کے انہیں آزمانے لگی ۔ پھینہ بیتنے کا انتظار کرنے لگی ۔ شلوار کا آسن لال ہونا بند نہ ہوا ۔ بچہ حاصل کرنے کی تمنا میں اس نے بھولو کمہار کو چھوڑا نہ رلدو چمار کو ۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر مُنیرا نے اپنی جھینپ مٹانے کی سوچی ۔ رگھو کو یاترا پر جانے کا بجھاؤ دیا ۔ بے چارہ مان گیا ۔ اسی دن سے مُنیرا کا پیٹ پھولنے لگا ۔ وہ اکثر بالکونی میں کھڑی دکھائی دیتی ۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتی رہتی ۔ پڑوسنیں کبھی اسے دیکھتیں کبھی ایک دوسرے کو ۔ بڑی بوڑھیوں کی آنکھوں میں اُمڑتی جگیاسا کو دیکھ کر مُنیرا نے کیرتن کا پربندھ کیا اور بھوج دینے کے لیے سادھو بٹھایا ۔

کیرتن ہوتا رہا بھوج چلتا رہا مُنیرا مسکراتی رہی ۔ پڑوسنوں کی دُعائیں بٹورتی رہی ۔ سارا وقت وہ رگھو کے پاس بیٹھی رہی ۔ رگھو کے سامنے کسی کو حوصلہ نہ ہوا کہ وہ مُنیرا کے پیٹ کو چھوئے یا اسے دھیان سے دیکھے مُنیرا ایک ہی رٹ لگاتی رہی ۔ پہلا بچہ تیرتھ استھان پر جنوں گی ۔ دیوتا کے چرنوں میں ۔

کئی مہینے شہر سے باہر رہنے کے بعد مُنیرا لوٹی تو اس کی گود خالی تھی۔ تانگے سے اُترتے وقت وہ بہت اُداس تھی۔ عورتیں اسے گھیرنے لگیں تو رگھو اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت پارو چاچی کے پاؤں چھو کر مُنیرا زور زور سے رونے لگی۔ دوسرے ہی پل خبر پھیل گئی کہ شہر ہی دوا خانے میں مُنیرا کے لڑکا ہوا تھا جو پیدا ہوتے ہی چل بسا۔

چار دن لڑکے کا سوگ منانے کے بعد مُنیرا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس نے محلے کے بچوں کو اپنے گھر بلانا شروع کر دیا۔ وہ ان سے لاڈ جتاتی۔ انہیں کھلاتی پلاتی اور ان کو کھیل کھلاتی۔ بڑے ہنس ہنس خوش۔ انہیں بچوں کی ہر وقت کی دیکھ ریکھ سے چھٹی ملی اور مُنیرا سے ہمدردی جتانے کا بہانہ ہاتھ لگا۔

یہ بھی زیادہ دن نہ چلا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر میں بندو کا ننھا مُنیرا کے گھر سے غائب ہو گیا۔ مُنیرا کو پتہ نہ چلا بچہ کب دالان پھلانگ کر گلی میں جا پہنچا۔ وہ اسے دور تک ڈھونڈ آئی۔ وہ نہ ملا۔ پتہ نہیں اسے زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ بدحواس مُنیرا کو شہر میں پچھلے دنوں ہوئی گھٹنا یاد آئی۔ ایک بانجھ عورت نے اپنی دیورانی کے کمسن بیٹے کو قتل کر کے اس کے خون سے اشنان کیا تھا۔ وہ کانپ اُٹھی۔

بندو کو بیٹے کے گم ہونے کی خبر ملی۔ روتی، پیٹتی، دہائی دیتی وہ مُنیرا پر جھپٹی۔ اسے بالوں سے پکڑ کر نوچنے کھسوٹنے لگی۔

"ڈائن! میرا بچہ کھا کر کیا تو ماں بن جائے گی..... ہائے میرا لال...... ہائے میرا منّا......"

پولیس آئی مُنیرا کو پکڑ کر لے گئی۔ کئی دن کی پوچھ تاچھ اور مار پیٹ کے بعد بھاگی کی ضمانت ہوئی تو اسے پتہ چلا رگھو صدمے کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ رگھو کو یقین تھا مُنیرا نے بچے کو مار ڈالا۔

"یہ عورت ماں بننے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔" وہ آخری دم تک بڑبڑاتا رہا۔

دو سال تک مُنیرا عدالتوں میں دھکے کھاتی رہی۔ آخر ثبوت نہ ملنے کی بنا پر بری ہو گئی۔

قانون کی نظروں میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی سماج کی نظروں میں قاتل بنی رہی۔ ہر کوئی اسے نفرت سے دیکھتا اور منہ پھیر لیتا۔

محلّہ میں اس سے کوئی بات تک نہ کرتا۔ سونا مکان کھانے کو دوڑتا۔ بند دکا کچھ پتہ نہیں کہاں سے پکارتا رہتا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو اور وہ آنٹی کو آواز دے رہا ہو۔ منیرا دن کو روتی رہتی رات کو ڈرتی رہتی۔ تنگ آ گئی منیرا نے بچے کو کھوجنے کے لیے دُنیا جہان ایک کرنے کی ٹھانی۔ مکان میں تالا ڈال کر وہ جس سمت پاؤں اُٹھے چل دی۔

آج کا بے رنگ موسم اپنے کو کوستا ہوا۔ اپنے پر آنسو بہاتا ہوا۔ مجھے پتہ ہے ایسے میں کافی ہاؤس والا واقف اجنبی آ جاتا ہے۔ بے شک میرے پاس میرا کالا کلوٹا باتونی دوست نہیں بیٹھا پھر بھی اجنبی اپنی کہنے سے نہیں رُکتا۔ وہ مجھے جتانا چاہتا ہے۔ آئینہ دکھانا چاہتا ہے۔ کالے کلوٹے بے کار کی باتیں ہانکنے والے جیسا ثابت کرنا چاہتا ہے وہ کسی طرح بھی منیرا کی کہانی بھولنے نہیں دینا۔ موقعہ ملتے ہی، موسم بگڑتے ہی اسے دہرانے بیٹھ جاتا ہے۔

گاؤں گاؤں گھومتی اور شہر چھانتی رہی منیرا۔ بچہ نہ ملا۔ تھک ہار کر اس نے دم لینے کو کلکتہ کے ایک بچہ خانے میں نوکری کر لی۔

بچہ خانہ کی بڑی ڈاکٹر ورجینیا منیرا کے کام سے خوش تھی۔ ایسی لگن والی اور مٹی ہوئی عورت اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دوسری عورتیں روتے یا بیمار بچے سے اکتا جاتیں۔ اس سے کترانے لگتیں۔ اس کی چیخیں سُن کر بھی ان سُنا کر دیتیں۔ منیرا کسی بھی حالت میں بچوں سے منہ نہ موڑتی۔ اپنے کو بھول کر انھیں سنبھالتی۔ جیسے وہ صرف ان کے لیے ہو۔

ورجینیا کے بہت کہنے پر منیرا نے اُسے اپنی کہانی سُنائی
ڈاکٹر نے منیرا کا معائنہ کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ اُلجھ کر رہ گئی۔ بڑا عجیب معاملہ

تھا۔ اس نے مُنیرا کو اگلے برس تک انتظار کرنے کو کہا۔ اگلے برس کلکتہ میں "ماں اور بچہ" پر ڈاکٹروں کی انٹرراشٹریہ کانفرنس ہونے والی تھی۔ مُنیرا کا کیس اپنی قسم کا تھا۔ دیش بدیش سے آنے والے ڈاکٹروں کے لیے کھوج کا موضوع۔ ڈاکٹری کی سائنس کے علم میں اضافہ کرنے والا معجزہ۔

اسی دوران ورجینیا نے مُنیرا کو بچہ خانے کے پلاسٹر کے ماڈل بنانے والے کارخانے میں ٹریننگ لینے کے لیے بھیج دیا۔

کارخانے میں سُندر اور سڈول بچوں کے ماڈل بنائے جاتے۔ دُور دراز پیدا ہونے والے خوبصورت بچوں کے فوٹو منگوا کر ماڈل تیار کیے جاتے۔ ان کو بیچنے سے جو آمدنی ہوتی اسے بے سہارا عورتوں اور لاوارث بچوں پر خرچ کیا جاتا۔

مُنیرا نے دیکھتے ہی دیکھتے ماڈل بنانے میں مہارت حاصل کر لی۔ جلد ہی وہ کارخانے کے ایک یونٹ کی انچارج بن گئی۔

کانفرنس کا دن آپہنچا۔ مُنیرا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی کوکھ اب بھی لہو چھڑکتی تھی۔ اس کی عمر ہی کتنی تھی مشکل سے چالیس سال۔ ایک بار ڈاکٹر اسے وشواس دلا دیں، وہ ماں بننے کی کوشش پھر سے شروع کر دے گی۔ دوبارہ شادی کرائے گی۔ کسی کے بھی ساتھ رہ لے گی۔ اپنے من کی سادھ پوری کرے گی اور ماں کے من کی آس۔ گھر واپس جائے گی۔ پہلا بچہ بندو کے قدموں میں ڈال کر کہے گی۔۔ یہ رہا تیرا لال ——

کانفرنس میں آئے جرمنی سے نابکا، فرانس سے سامو اور بارنز انگلینڈ سے جیمیس اور امریکہ سے رنگوے اور ریل سالو۔ اور روس سے نکرلائی اور چرت کو دوسرے دیشوں کے ڈاکٹر بھی تھے۔ ان سب کے ساتھ آئے تھے ان کے بیوی بچے۔

کانفرنس شروع ہونے سے پہلی رات مُنیرا ڈاکٹر ورجینیا کے ساتھ بدیسی ڈاکٹروں کو دیکھنے گئی۔ ان کی بیویوں سے بات کرتی ہوئی وہ ان کے بچوں کو پچکارنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے اس کے من میں بس گئے۔ ان کا شرارتی بھولاپن اس کی آنکھوں میں سما گیا۔ وہ اپنے سے کہہ اُٹھی —— میرے ماڈل! میری منزل! دوسرے بھی

لمحہ وہ ڈاکٹروں کو نہارنے لگی ـــــ کاش اِن میں سے کوئی ایک میری.....

مُنیرا کے کیس کو خاص اہمیت دی گئی ـــــ کئی گھنٹے اس کا معائنہ ہوتا رہا۔ کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ شام کو پھر کانفرنس ہوئی۔ تمام رپورٹیں اکٹھی کرنے پر بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا ـــــ اگر مُنیرا کے کوکھ ہے تو اسے اپجاؤ بنانا مشکل کام نہیں..... مُنیرا کے اندر کوکھ جیسی چیز ضرور ہے ورنہ وہ ہر مہینے وقت پر لہو نہیں چھڑک سکتی.....

تھک ہار کر ڈاکٹروں نے پھر مُنیرا کو بلایا۔
"تم نے لڑکپن میں کوئی دوائی کھائی تھی؟"
"کھائی تھی۔"
"کتنی دیر کھائی؟"
"چھ مہینے۔"
"دوائی دینے والے ڈاکٹر کا نام اور ڈگری؟"
"وہ تو وَید تھا۔ ہمارے شہر کا گوکل وَید۔ ڈگری وگری کوئی نہیں۔"
"دوائی کا کیا اثر ہوا؟"
جواب دینے کی بجائے مُنیرا نے دوپٹہ سینے پر کھینچ لیا۔ اس کا ہاتھ شلوار کے آسن پر جا پہنچا۔
ڈاکٹر تابک مُسکرایا ـــــ رنگوے نے پہلو بدلا۔ سامو کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر رپورٹ لکھی گئی۔
مُنیرا بانجھ تھی۔ اس کے اندر کوکھ نہیں تھی۔ کوکھ کی جگہ ناسور تھا۔ ناسور گوکل وَید کی دوائی کھانے سے پیدا ہوا تھا۔ لنبے اور دیکھنے میں وہ کوکھ جیسا تھا۔ وہ ہر مہینے پھوٹتا اور مُنیرا کی شلوار لال ہو جاتی۔ پھر وہ کوکھ کی طرح ہی بند بھی ہو جاتا تھا۔

رپورٹ پڑھ کر مُنیرا کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک بھرم تھا جو اسے لیے پھرتا تھا۔

اسے گھر یاد آیا ـــــ لوگ اب تک سب بھول گئے ہوں گے ـــــ اس نے اپنے کو تسلی دی۔

گھر پہنچ کر منیرا نے ہاتھ سے دھکیلی جانے والی بچہ بگھی بنوائی۔ اسے رنگ برنگے پھول پتّوں سے سجایا۔ بیٹری ہیڈ لگا کر ایر کنڈیشنڈ بنایا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کا سامان لگایا۔

بگھی کا نام رکھا ـــــ میمورِ بگھی ـــــ

میمورِ بگھی تیار ہو گئی تو منیرا نے کسی کا بچہ گود لینے کا ارادہ کیا۔ پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا ـــــ کوئی مجھے اپنا بچہ کیوں دینے لگا ـــــ ؟

ہمت کر کے اس نے محلے کی عورتوں سے ان کے بچے کھلانے کی آگیا مانگی۔

بندو نے یہ بھی نہ ہونے دیا۔ سب نے اسے ڈائن کہہ کر دھتکار دیا۔

نراش ہو کر منیرا نے محلہ کے بچوں کا خیال چھوڑ دیا۔ کانفرنس میں آئے ڈاکٹروں کے بچوں کو یاد کیا اور ان کے ماڈل بنانے میں جٹ گئی۔

منیرا دن ڈھلتے ہی شیشے کی رنگین بگھی صاف کرتی ہے۔ اس میں بدیشی ڈاکٹروں کے بچوں کے ماڈل سجاتی ہے۔ انھیں چومتی ہے۔ پچکارتی ہے۔ دلارتی ہے۔

محلے کی عورتیں اپنے گھروں کے دروازوں پر آ کھڑی ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے کھڑے ان کے بچے بھی منیرا کو بگھی دھکیلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

منیرا پلاسٹر کے ماڈل سنبھالتی ہوئی ان کے پاس سے گزر جاتی ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنی ماؤں کے دامن پکڑے کھڑے بچوں کو اداس نظروں سے دیکھتی ہے۔

گلی کی نکڑ پر بستی ختم ہو جاتی ہے۔

نکڑ پر پہنچ کر نیرا بگھی روک لیتی ہے۔

بنجر کے آگے بنجر کھیت کے کنارے بیٹھے مریل کسان کو دیکھتے ہی نیرا کے دل میں ہوک اُٹھتی ہے ــــــ وہ بگھی کی طرف پلٹتی ہے۔

بگھی میں پڑے بے حس ماڈل۔ دوسروں کے کھیت کی ترکاریاں۔

ایک ٹانگ کی گڑیا

اس دن میں بہت اُداس تھا۔

اپنے آخری دنوں میں وہ بھی اُداس رہنے لگا تھا۔

ان دنوں اس کے مُریدوں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ وہ ان کی طرف دھیان جو نہ دیتا۔ ان کی بجائے وہ اپنے گتے میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔

میرا خیال تھا او گھڑ پیر کو اپنے لنگڑا ہونے کا کوئی غم نہیں۔ لیکن اس کے آخری دنوں میں میرا بھرم ٹوٹنے لگا۔ میں اس کی بے چینی کا کارن کھوجتے ہوئے اس کی بائیں ٹانگ کو دیکھتا رہتا۔ وہ بھی اسے ٹٹولتا ہوا اندر ہی اندر ٹوٹتا رہتا۔ پہلے کافی ہاؤس بند ہوتے ہی اپنے گرد اکھٹا ہونے والوں کو دیکھتا ہوا وہ کسمسانے لگتا اس کی زرد آنکھوں میں عجیب چمک آجاتی۔ دن بھر کی خجالت کو جھاڑ کر وہ اپنی بیساکھی کے سہارے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ دو چار قدم لڑکھڑانے کے بعد بڑی روانی سے ناچتا ہوا اپنے دھول بھرے لمبے بالوں کو جھٹکنے لگتا۔ ہماری حیرت بڑھتی جاتی۔ دھیرے دھیرے ہم اس کے ناچ میں کھو جاتے۔ پھر وہ گھڑی آتی جب اس کی آدھی ادھوری ٹانگ بیساکھی میں جذب ہو جاتی۔ ہمیں یقین ہو جاتا —— پیر لنگڑا نہیں ہے اس کی دونوں ٹانگیں سالم ہیں۔ اس کے ناچ میں کوئی کجی نہیں۔ وہ زندگی کی تال کو پہچانتا ہے اور اس کی لے پر ناچتا ہے ——

لوگوں کے من کو پڑھتے ہوئے میرے منہ سے نکل جاتا:

"یہ پہنچا ہوا فقیر ہے۔ بیساکھی کو زندہ ٹانگ بنانے کا گر جانتا ہے۔"

بھگتیں کو میری بات پر سر ہلاتے دیکھ کر پیر کی داڑھی مسکرانے لگتی۔ اس میں اٹکے تنکے تھرکنے لگتے۔ پیر بیساکھی کو پھینک کر ایک ہی ٹانگ پر ناچنے لگتا اور اپنے بازو آگے کو پھیلا دیتا پھر ہاتھوں کو اوپر اٹھا دیتا۔ جیسے دنیا بھر کے دین دکھیوں کے لیے دعا کر رہا ہو۔

وہ ناچتا رہتا اور اس کا چھوٹے قد کا کتا کوں کوں کرتا ہوا اس کی بیساکھی کو چاٹتا رہتا۔ مجھے وشواس ہو جاتا کہ پیر کو اپنے لنگڑا ہونے کا کوئی ملال نہیں کبھی کبھی مجھے لگتا وہ اپنے اپاہج ہونے کو وردان سمجھتا ہے۔

یہ بات اس وقت کی ہے جب کافی ہاؤس دھرتی پر تھا۔ پیر اس کے سامنے والے نیم کے پیڑ کے نیچے ڈیرہ ڈالے پڑا رہتا۔ اپنی چیتھڑوں کی پوٹلی اور ٹین کے ڈبے کو پیڑ کی جڑ میں رکھے سگریٹ بیڑی پھونکتا رہتا۔ کافی ہاؤس کی طرف دیکھتا ہوا اپنے کو اندر ہی اندر کھوجتا رہتا۔

اس کے گرد بھیڑ کے اکٹھا ہونے میں اس کی نگاہوں کے زرد سونے پن کا بڑا ہاتھ تھا۔ لوگ اس میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ پیر مسکرانے لگتا۔ ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کو نگاہوں کے پھیکے پن میں گھلتے دیکھ کر مرید عقیدت سے بھر جاتے تبھی پیر صدا لگانے لگتا۔ اونگھتے آس پاس کو آنکھیں ملتے دیکھ کر میں بول پڑتا ——— "یہ صدا نہیں فطرت کے دل کے ناسور کی ہوک ہے" ———

مریدوں کو سن ہوا دیکھ کر پیر اپنی پوٹلی سے چیتھڑا نکالتا۔ اسے زمین پر بچھا کر مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا۔

چند ہی لمحوں میں وہ اپنے کو سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اسے اپنے میں ڈوبا دیکھ کر لوگ منتیں ماننے لگتے۔ اس کے گھور گمبھیر چہرے کو دیکھتے ہوئے سجدہ کرتے اور اپنے ٹھکانوں کو چل دیتے۔

رات گئے آکاش کی آنکھیں ٹپکنے لگتیں۔ پیڑ سسکیاں بھرنے لگتا۔ دھرتی بھی بلکنے لگتی۔ پیر آنکھیں کھولتا۔ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر کہتا:

"تم اس زرد چہرے والے سے ناطہ توڑ لو۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ میرے پاس بھی اسے دینے کو کیا دھرا ہے! اس کی میرے لیے عقیدت بھی اس کو نجات نہیں دلا سکی۔"

مجھے خاموشی سے اپنی بات سنتے دیکھ کر وہ بیڑی سلگا لیتا۔ دو چار کش کھینچنے کے
بعد اسے زمین پر مسل دیتا:

"تم اس کا مارگ جانتے ہو نہ منزل۔ اس کے انتشار کا ٹھکانہ نہیں۔ ہسپتال کے
عقب میں رہتے رہتے وہ دماغی دق میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرا پرانا مریض ہے۔ بہت پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے آئینہ دیکھ کر
دہشت ہوتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ کہتا تھا آئینے میں پہلے اسے ایک کے دو، پھر دو کے چار اور پھر ان گنت چہرے
دکھائی دینے لگتے ہیں۔"

"اس کا کارن بھی بتایا ہوگا۔"

"وہ کوئی ڈاکٹر تھوڑی ہے۔ لیکن مجھے پتہ ہے کہ اس پر دق کے زہر کا اثر ہے۔
اس روگ کے مردہ ہیجان نے اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا ہے۔ اس کی کسی بات میں ٹھہراؤ
نہیں رہا۔ اب وہ کسی پل کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن وہ آئینے سے ہی بھڑ جائے
اور کانچ کے ٹکڑے اس کے رگ و ریشے کو کاٹ ڈالیں۔

"پھر تو اسے بچانا چاہیے۔"

"کوئی کسی کو بچا سکتا ہے؟" پیر نے میری بات کو رد کرتے ہوئے پوچھا "کیا
اس نے کبھی تمہارے ساتھ کافی پیتے ہوئے اچانک ہی کہنا شروع نہیں کر دیا؟"

"کیا کہنا شروع نہیں کر دیا؟"

"یہی کہ تیرہ سے بھاگنے والے پانچوں میں سے ایک بھی نہیں بچا۔ تین پولیس کی گولی کا
شکار ہو گئے اور دو نے آتم ہتیا کر لی۔"

"کئی بار وہ بڑبڑایا ضرور ہے لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔"

"یہی بڑبڑاہٹ اس کی بیماری کی نشانی ہے۔ اس کا منہ سے نکال بات کے بیچ
سگرٹ مانگنا اور سگریٹ ملتے ہی ڈبیا کے لیے گڑگڑانا اسی بیماری کے کارن ہے۔ تو اس
پر قابو نہ رہنے سے لفظوں پر بھی کوئی...... ورنہ...... خیر تم اس سے پیچھا چھڑاؤ۔ اب تو اس

کے چہرے پر تابنی چمک بھی لہرانے لگی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے منہ سے جھاگ چھلکتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیوں نہیں سمجھتا کہ بات ڈھیر لگانے کی نہیں بات کاٹ چھانٹ کرنے کی سوجھ بوجھ ہونے کی ہے ...... لیکن بندر کے ہاتھ بلیڈ لگ جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے ......!"

پیر خاموش ہو جاتا۔ آس پاس ماتمی دھن گونجنے لگتی۔ میرے من کے پردے پر ایک کے بعد دوسرا چہرہ ابھرنے لگتا۔ اس پر پیر کا جھنجھلانا یاد آتا۔ اور سامنے کی چیز دور اور دور کا منظر بالکل سامنے دکھائی دینے لگتا۔ پیر کی خاموشی بولنے لگتی:

"تم تو اس کی محبت سے بھی باز نہیں آتے جس کے بازو کہنیوں تک برف میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اسے صرف سردی ستاتی ہے جھلس کر رکھ دینے والی لو کا احساس تک نہیں۔ کیا تماشہ ہے کہ اس کے لیے موسم تین چوتھائی مر چکا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ ایک باگ کا گھوڑا ایک ہی سمت میں سرپٹ رہتا ہے لیکن دشائیں ان گنت ہیں۔ کاش وہ جانتا کہ کوئی راہ منزل تک نہیں جاتی بر دشاؤں کو بدل بدل کر پہنچنے میں ہی ہماری مکتی ہے۔ صرف برف کی بات کرنے، اس میں دفن اپنے بازوؤں کو دیکھ کر چونکنے اور اس کی دہائی دینے سے کچھ بھی بننے والا نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم کولہو کا بیل بن جائیں ......!"

فضا میں گھر کرتی ٹھنڈک کو محسوس کر کے میں پہلو بدلتا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سامنے روس کی یاترا سے لوٹے سرکاری لوٹن کبوتر کا چہرہ آ جاتا۔ وہ بار بار کہتا ـــــــ تم نہیں جانتے تمور کا کوٹ اور سماوار کیا چیزیں ہیں ـــــــ ہمیں اپنی بات پر مسکراتے دیکھ کر اس کا روز بروز چوڑا ہوتا ہوا ماتھا کھل اٹھتا۔ وہ لوٹنے مرجھائی پسینہ پسینہ ہوتی شام کو بھول کر اپنی گود میں پڑے تمور کے کوٹ کو اوڑھنا شروع کر دیتا ـــــــ میں اسے کافی پینے کے لیے کہتا تو وہ گھر میں پڑے سماوار کی یاد دلاتا ـــــــ اب میں کافی نہیں پیتا۔ سماوار میں بنے قہوے کے سوائے مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا ـــــــ

"میں نے ٹرانسپورٹ بھون کا انچارج ہوتے ہوئے بھی یاترا نہیں کی۔ میرے دفتر میں دنیا بھر کے سندر استھانوں کے چتر لٹکے ہیں، لیکن فاصلہ طے کرنے کا ساکھ میرے بھاگیہ میں نہیں نردوشوں کو اپدیش دینے اور خوشے اور استھان کو سر کرنے میں ناکام رہنے جیسا دکھ کوئی نہیں۔ صرف ذریعہ مل جانے سے منزل نہیں مل جاتی ......" وہ بلور اٹھا کر پھر پپوٹوں میں سجا لیتا۔

"اسی کو بدقسمتی کہتے ہیں۔"

پٹھان کو یوں اُداس ہوا دیکھ کر مجھے پیر کی بات یاد آجاتی ـــــ اتنے بڑے ڈیل ڈول کے آدمی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کہیں سے چلتے ہیں نہ کہیں پہنچتے ہیں۔ یاترا پانو پر چلنے کا نام نہیں ...... دراصل دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چلتا ـــــ وقت نہ ہم ـــــ

ـــــ داتا ورن کے بے چین ہوتے ہی پٹھان کی دائیں طرف بیٹھا ڈاک بابو کافی کا پیالہ میز پر رکھ دیتا اور اپنی پائپ سے کھیلنے لگتا۔ وہ اس وقت کو یاد کرتا جب وہ محض ڈاکیہ تھا۔ لوگوں کو چٹھیاں بانٹنے سے پہلے انھیں پڑھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اب بھی وہ باہر کے دیشوں سے آنے والی ڈاک کو کھولنا نہیں بھولتا۔ ان میں سے ایک آدھ خط اب بھی خود اس کے مالک تک پہنچتا ہے اور انہیں اس میں لکھی تحریر کو سمجھاتے ہوئے اندر ہی اندر پھولتا رہتا ہے ..... پائپ کو صاف کرتے ہوئے وہ سمرقند اور شکاگو سے آئے ان خطوط کو یاد کرنے لگتا جس میں لکھا ہے ـــــ ہم زندہ ہیں اس لیے محسوس کرتے ہیں ـــــ ہم محسوس کرتے ہیں اس لیے زندہ ہیں ـــــ ایسے معاملے کی باریکی کو سمجھنے میں ناکام ہوا دیکھ پیر کہتا ـــــ یہ بے چارہ نہیں جانتا کہ ہماری پیاس ہمارے اندر کے چشمے سے ہی بجھ سکتی ہے ـــــ پیر کی بات کے کانوں میں گونجتے ہی میں ڈاک بابو کی طرف دیکھنے لگتا۔ وہ اپنی مسکین مونچھوں کو اور بھی دبانے کی کوشش کرتا تو مجھے اس کے ڈرائنگ روم میں سجے کاغذ کے پھول یاد آنے لگتے ـــــ

مجھے کافی ہاؤس کلچر کی بابت سوچتے پاکر پیر آکاش میں پھیلے ستاروں کو دیکھتا اور جھلا اُٹھتا:

"یہ دیودھر بھی خوب ہے۔ یونیورسٹی کے پروفیسر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اس سے کوئی بات کرو اپنی جیب ٹٹولنے لگتا ہے۔ یہ آدمی ہے یا کوڑے دان؟ بھلے ہی اس میں کچرے کی بجائے ہیرے پڑے ہوں۔ سارے گیان دھیان کے باوجود اس بے چارے کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ سچائی بھرم کے سہارے کھڑی ہے اور ہر بھرم میں کہیں بہت اندر سچائی اونگھ رہی ہے۔ ویسے تالستائی، نطشے، برگساں اور رِلکا سو پر چرائی ہوئی تنقید نشر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ آخر چور بھی مالدار کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ بھلے ہی ایک دن ندامت .....؟"

پیر کی بات سن کر میں حیرت میں ڈوب جاتا ـــــ یہ آدمی کافی ہاؤس کے باہر

سے ہی اندر بیٹھے لوگوں کی بابت کیسے جان لیتا ہے ـــــــ مجھے کافی ہاؤس ایک مُردہ گھر دکھائی دینے لگتا جہاں ہم سب اپنا اپنا پوسٹ مارٹم کرنے پر بھی خود کو جان نہیں پاتے۔ ہمارے اندر کی سٹرانڈ ہی ہمیں خود فریبی میں ڈال کر اپنے سے بہت دور کر دیتی ہے ـــــــ میں پیر سے پوچھتا ـــــــ کیا ہم میں سے کوئی بھی سالم نہیں ہے؟ ـــــــ پیر جواب نہ دیتا۔ اس کی خاموشی اور بھی گہری ہو جاتی۔ رات بھی تھک ہار کر اونگھنے لگتی۔ دھیرے دھیرے بے بسی کی چادر اوڑھ کر سو جاتی ـــــــ

پھر وہ رات آئی جب راج بھون کا کردوھپا گل پن کی حدوں میں داخل ہو گیا۔ اچانک ہی سب کچھ مسمار کیا جانے لگا۔ جان، بے جان ہر چیز کو انجانے میں دھر لیا گیا۔ اس رات کافی ہاؤس کو بھی ملیامیٹ کر دیا گیا۔ اس کے ستھان پر ایک انڈر گراونڈ مارکیٹ بنانے کا اعلان ہو گیا۔

پیر کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ دھرتی سے اس کا عشق جنون میں تبدیل ہو چکا تھا اور نیا کافی ہاؤس بارہ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔

پیر بڑی مشکل سے اپنا اڈہ چھوڑ کر نئے کافی ہاؤس میں جانے کو راضی ہوا۔ اپنی بیساکھی، چیتھڑوں کی پوٹلی اور ٹین کا ڈبہ سنبھال کر چل پڑا۔ اس کا چھوٹے قد کا باریک آواز والا کتا بھی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے بار بار کتے کی طرف دیکھتے پا کر وہ رک گیا:

"شاید تمھیں بدھشٹر کا کتا یاد آ رہا ہے؟" وہ مسکرایا "یہ وہ تو نہیں لیکن اس سے کم بھی نہیں،" وہ پھر چلنے لگا۔

کافی ہاؤس والی بلڈنگ کے بڑے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گیا "اگر میں یہیں ڈیرا ڈال دوں؟" اس نے میری طرف پہلی بار بے بسی سے دیکھا۔

"نہیں یہاں بیٹھنے سے بات نہیں بنے گی۔"

"اچھا چلو،" تھوڑا سوچ کر وہ سیڑھیاں چلنے لگا۔

کافی ہاؤس تک پہنچنے کے لیے چالیس سیڑھیاں تھیں۔ پہلی دس چڑھتے چڑھتے اس کا دم پھول گیا۔ وہ رکا نہیں لیکن اکیسویں سیڑھی پر پانو رکھتے ہی وہ لڑکھڑا گیا۔

"میں اوپر نہیں جاؤں گا،" اس نے اپنے کو بڑی مشکل سے سنبھالا "یہ سیڑھی دوسری سیڑھیوں کے مقابلے میں کافی بڑی ہے۔" اس نے سیڑھی کے کونے میں پوٹلی اور ڈبہ رکھ

دیا اور بائیں پہلو میں بیساکھی کو لٹا کر دہیں بیٹھ گیا۔

اس دن سے پیر اداس رہنے لگا۔ اس دن اس نے کچھ نہ کھایا۔ میرے بہت کہنے پر آدھی رات کو ایک پیالہ کافی پی۔ پھر اکتاہٹ بھرے لہجے میں مجھے گھر جانے کے لیے کہنے لگا۔ دوسری شام کو اس کی عجیب حالت تھی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک ٹانگ والی گڑیا تھی۔ گڑیا کو دیکھتے ہوئے وہ روئے جا تا تھا۔ روتے روتے اپنی بیساکھی چاٹتے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے گڑیا ہاتھ سے چھوڑی نہ رونا بند کیا تو میں نے پوچھا ـــــ "یہ کیا ہے ؟"

"یہی تو ہے جسے میں نے آج تک چھپائے رکھا۔" اس کی آواز میں تھکن اور اداسی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ "یہ مجھے ایک کمہارن نے دی تھی۔ ان دنوں میں گلی محلے گھومتے ہوئے صدا لگاتا اور لوگوں کو ان کی نجات کا یقین دلاتا پھرتا تھا.... " پیر نے آہ بھری۔ "ایک دن وہ کمہارن میرے پاس سے گزر رہی تھی۔ میری صدا سن کر رک گئی۔ ایک پل میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنے سر پر رکھے ٹوکرے میں سے یہ گڑیا نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ مجھے اپنی طرف حیرت سے تکتے پا کر بولی ـــــ اسے سنبھال کر رکھنا ـــــ اسی دم مجھے لگا گڑیا بے جان مٹی نہیں ہے ـــــ لیکن میں نے اسے جھونپڑے میں چھپا دیا۔ آج برسوں بعد اسے نکالا ہے ....." پیر خاموش ہو گیا۔

"وہ کیوں ؟"

"کل ہیر کی پر لڑکھڑاتے ہی مجھے اس کا خیال آیا اور اس کے بھید کا پتہ چل گیا۔"

"کون سے بھید کا ؟"

"یہی کہ اس گڑیا نے اپنی رچنا کے دوران کمہار کے وجود سے منکر ہونے کا پاپ کیا۔ کمہار نے اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ نہیں جانتی تھی ..... یہ بے چاری نہیں جانتی تھی۔" پیر ولاپ کرنے لگا۔

"کیا نہیں جانتی تھی ؟" میں سہم گیا۔

"یہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ ایک آنچ کی کسر کا نتیجہ کتنا المناک ہوتا ہے۔ ایک آنچ کی کسر آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتی ....." پیر کافی ہاؤس کو جاتی باقی سیڑھیوں کو غمناک آنکھوں سے دیکھتا ہوا کتے کو سہلانے لگا۔ "اب مجھے اس جانور کا ہی بھروسہ

رہ گیا ہے۔"

مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر وہ بولا "شاید تم حیران ہو گئے۔ یہ بھکارن کا کتا نہیں جو اپنی مالکن کے مرتے ہی اس کی لاش کو لاوارث چھوڑ کر روٹی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔"

"کیا کہتے ہو؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں غلط نہیں کہتا۔ مجھے وشواس ہے میرے مرنے کے بعد یہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا آپ لوگوں کا انتظار کرے گا شمشان گھاٹ تک میرا ساتھ دے گا۔ دیکھتے نہیں آج بھی میری بیساکھی کو کتنے پیار سے چاٹ رہا ہے" بیرے نے پھر کتے پر نظریں جما دیں۔

"میری ایک ہی تمنا ہے۔ میں اپنا مردہ خراب نہیں ہونے دینا چاہتا....."

اس دن کے بعد بیرا اٹھ کر کھڑا ہوا نہ اس نے ناچ کر دکھایا نہ صدا ہی لگائی۔ اس نے اپنے بھگتوں سے منہ موڑ لیا۔ اب وہ تھا، مٹی کی لنگڑی گڑیا تھی، چھوٹے قد کا کوں کوں کرتا کتا تھا جو لگاتار بیساکھی کو چاٹتا رہتا تھا۔ وہ مجھے بھی بھلا دینے پر تل گیا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے دن تھوڑے ہیں۔ میں نے ایک بیرے کو راضی کیا کہ اگر وقت بے وقت کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو مجھے فون کر دے۔

دوسرے ہفتے بیرے نے مجھے بیر کے مرنے کی اطلاع دی۔ میں نے فوراً پوچھا۔ "اس کا کتا تو اس کے پاس بیٹھا ہے؟"

میری بات کا جواب نہ دے کر اس نے مجھے کافی ہاؤس پہنچنے کے لیے کہا۔

کافی ہاؤس کی اکیسویں سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میری روح سن کر دی۔

بیر چت لیٹا تھا اس کے سینے پر ایک ٹانگ کی گڑیا اوندھی پڑی اس کی داڑھی چوم رہی تھی اور اس کا کتا بڑے شوق سے اس کی آدھی ادھوری ٹانگ کو چبا رہا تھا۔

مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ وہ غرایا اور مجھ پر جھپٹا میرے پیچھے ہٹتے ہی اس نے پھر اپنے دانت لنگڑی ٹانگ میں گاڑ دیے۔

پانڈو لپی

(دیوبند رسیتارتھی کے حضور میں)

یاتری وہ جو لوٹ کر نہ آئے ۔
ودیارتھی گرو پر ہنس دیا ۔
تم نے شبد کا ارتھ جان لیا !
داتا ورن کو بکھرتے سمٹتے دیکھ مجھے یقین ہو گیا ہے بھاگیرتھ دادا لوٹ آیا ۔ لیکن آج دادی
اُسے .....
رات اس سے زیادہ کیا گذرے گی ! دسمبر کے آخری ہفتے کی تیسری رات ۔ برفیلی اور غصیلی ۔
ہوا چیخ رہی ہے سڑک کا پیپل کراہ رہا ہے کالا آکاش ڈرا رہا ہے ۔ مجھے بھاگیرتھ دادا کا خیال آ رہا ہے ۔
مجھے یقین ہے آج دادی نے اُسے .....

یاتری ناؤ کو دیکھتے ہی ندی کو بھول کر منزل کی آس میں کھو جاتا ہے ۔
دادی نے پچھلی رات بھی یہی بتایا :
ندی پار کرتے ہی یاتری ناؤ کو بھول جاتا ہے ۔
دادی نے بھاگیرتھ دادا کے نام کی روٹی بیلنی بند نہیں کی ۔
یاتری کو وشواس ہوتا ہے لوٹنے پر گھر کا دروازہ کھلا ملے گا ۔

تمہارا دادا اسی وشواس کے ساتھ لوٹتا ہے ۔میں ہر روز رات کے وقت بند کواڑوں کو دیکھتی ہوئی اُس کے نام کی روٹی بیلتی ہوں ۔

مجھے دیر نہیں کرنی چاہیئے ۔ رات کی یخ بستگی کئی گنا بڑھ گئی ۔ دادا کا جھڑتا جسم اور گھٹتی طاقت اس سردی کو .....

تم وہ کرو جو کسی نے نہ کیا ہو

دادی پھر بولنے لگی ۔ اپنی آنکھوں کے گرد پھیلا جھریوں کا جال کھولنے لگی :

سنسکرت کے شلوک کا ارتھ سمجھاتے سمجھاتے بھاگیرتھ تھالی پرے ہٹا اُٹھ کھڑا ہوتا ۔ مجھے گم سم بیٹھی چھوڑ جھولا کندھے سے لٹکا چل دیتا ۔

سیپ کی کوکھ میں جانے کی خواہش ہر بوند کو ہوتی ہے ۔تیرا دادا یہی کہتا ۔

دادی روٹی کو اُلٹ کر بیلنے لگی :

میں بھاگیرتھ کو جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ۔ اُس کی پیٹھ کو نہارتی ہوئی اُس کی منگل کامنا کرنے لگتی وہ دوری میں پرچھائیں جیسا لگتا ۔ آخر پرچھائیں بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ۔ صرف راستہ آنکھوں میں اٹک جاتا ۔ جانے والے کے لوٹنے کی علامت ۔

میں اُٹھتا کیوں نہیں ۔ دادی کی بات غلط نہیں ہو سکتی :

بھاگیرتھ کا جانا اور لوٹنا ایک جیسا ۔ نہ جانے کا وقت نہ آنے کا سمے ۔ کواڑوں پر دی جانے والی دستک کا انتظار ۔ باہر کی آندھی اندر کے جھگڑے سے لپٹ جانے کو بے قرار ۔ طوفان لہروں کو ساحل کا مُنہ چومنے کا موقع مہیا کرتا ہے مچھلی نے ماہی گیر سے کیا کہا ؟

قصور میرا ہے دادی کا نہیں ۔ اگر بھاگیرتھ دادا کو کچھ ہو گیا تو پاپ مجھے لگے گا ۔ مجھے یقین ہے دادی آج اُسے ..... کل رات سے پہلے کی کہانی اور ہے ۔

دادی بولتی رہی :

کئی بار بھاگیرتھ برسوں بعد لوٹا ۔ یہ نہ پوچھو اُس کی غیر حاضری میں میں نے زندگی کیسے بتائی ۔ وقت بتایا نہیں جاتا بیت جاتا ہے ۔ زندگی اور موت وقت کے اسی گن

کو کہتے ہیں۔ آغاز، درمیان، اختتام ——— وقت کا وردان۔ ناٹک شروع ہوئے کتنی دیر ہو گئی!

بھاگیرتھ جانتا تھا گھر میں سوائے ہوا پانی کے اور کچھ نہیں۔ اس پر ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری بچّی کا بوجھ۔ نہ ساس نہ سسر۔ نہ دیور نہ دیورانی، نہ جیٹھ نہ جیٹھانی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں محنت کرتی رہی۔ لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا اور بچیوں کا پیٹ پالتی رہی تو کون سی بڑی بات ہو جائے گی۔ بات تو بھاگیرتھ کی ہے۔ وہ چلا جاتا ہے۔ میں اس کی راہ دیکھتی ہوں ——— اُس کے کندھے سے لٹکتا جھولا..... مجھے آج بھی یقین ہے تیرا دادا اپنے جھولے میں.....

شادی کے بعد تیسرے برس ہماری پہلی لڑکی پیدا ہوئی۔ رنگ رُوپ میں بھاگیرتھ پر تھی۔ سُرخ سپید، گول مٹول۔ بھاگیرتھ اُسے دیکھتا رہتا۔ مسکراتا رہتا۔ اُسے بچّی کا نام نہ سُوجھتا۔ ہر کسی سے پُوچھتا۔ آخر مجھے اور بچّی کو ساتھ لے کر بن بھیا جل پربت پر بیٹھے سادھو کے پاس جا پہنچا:

"اس کا نام کرن سنسکار کیجیے مہاراج!" بھاگیرتھ نے بچّی کو سادھو کے چرنوں میں لٹا دیا۔

"نام اور دھام سے سادھو کو کیا کام!" سادھو نے ایک نظر بچّی پر ڈالی اور کٹیا سے باہر پھیلے جنگل کو دیکھنے لگا۔

اُسی دم جنگل سائیں سائیں کرنے لگا۔

نہ پتّہ ہل رہا ہے نہ شاخ پھر یہ آواز کیسی!

میں نے بچّی کو اُٹھا لیا۔

"تم اپنے من کے جنگل کو بین کرتے دیکھ ڈر گئی ہو" سادھو کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

"جنگل میں بھیڑیا رہتا ہے" پہاڑ سے نیچے اُترتے ہی بھاگیرتھ بڑبڑایا۔ اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

گھر سے روانہ ہوئے تو ہم تین تھے۔ لوٹ کر گھر پہنچنے والے...؟

بچّی کی لاش میں نے بہتی ندی میں بہا دی۔ بھاگیرتھ چلتے چلتے رُک گیا اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا:

"تم گھر جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

دادی نے چکلے پر پڑی روٹی پر ہاتھ پھیرا:
تین برس بعد لوٹا تھا بھاگیرتھ۔ میں نے اُسے تازہ اور گرم کھانا کھلایا تھا۔
وہ کھاتا رہا میں اُس کے چہرے پر پھیلی کالی داڑھی کو دیکھتی رہی۔
"جانتی ہو میرے جھولے میں کیا ہے؟" اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔
میں نے جھولا اپنی طرف کھینچ لیا۔ اُس میں ہاتھ ڈالا تو میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ جھولے میں ہرن کی کھال کا ٹکڑا تھا اور کچھ نہیں۔
بھاگیرتھ مسکرایا اور میری بے چینی کو اَن دیکھا کر کے بولنے لگا:
گنا ڈھیہ پنڈت کی نہ پوچھو۔ بے چارہ آج بھی جنگل میں رہتا اور اپنی پوتھی پترا پناہوں کنڈ میں ڈالنے پر مجبور ہے۔ یہ ہرن کی کھال کا ٹکڑا نہیں اتہاس کا امرٹ پنا ہے۔
سادھو ٹھیک کہتا تھا۔ ہم جنگل سے نہیں بچ سکتے۔ اُسی کے ستائے ہوئے ہم اُسی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں مشکل کا کوئی حل نہیں۔ ورنہ گنا ڈھیہ پنڈت اس یگ میں ہرن کی کھال پر ہرن کے خون سے لکھنے پر کیوں مجبور ہوتا۔ کاغذ، قلم اور سیاہی کا یگ!
بڑا عجیب دیش تھا۔ لوگوں کو اپنا راجہ چننے کی آزادی۔ راجہ کو لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی آزادی، ہر کوئی گدی پر بیٹھنے کو بے چین۔ راج کرنے اور لوگوں کی بھلائی کرنے میں بڑا فرق ہے۔ آدرش کے معنی بدل گئے۔ آنے والے چناؤ پر نظر رکھو۔ ہونے والے خرچ کا خیال کرو۔ چناؤ کو غنڈوں کا کھیل بنانے میں اپنی بھلائی سمجھو۔ برائی سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ آدرش زندہ باد! کچھ بھی کر سکنے کا بے ضرر ذریعہ!... لوگ نعروں کے غلام ہیں کام کو کون دیکھتا ہے شرافت چناؤ کے اکھاڑے میں اُترنے کا حوصلہ نہ کر بیٹھے۔ ننگے ہو جاؤ لوگ آنکھوں پر ہاتھ دھر لیں گے۔ کرسی ہتھیانے کے لیے سب کی سُنو۔ کرسی ہتھیانے کے بعد...؟

بھاگیرتھ بولتا رہا۔ میں اُس کے زخم دھوتی رہی۔ اچانک اُس نے بولنا بند کر دیا اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا:
تم نے الماری تو نہیں کھولی؟ اُس میں پڑی پانڈولپی تو نہیں نکالی؟ میں یہ سب بھی کاغذ پر اُتاروں۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں باہر بیٹھی اُس

کے دکھوں کو یاد کرنے لگی۔ اُس کے لیے شردھا سے بھرنے لگی۔

گنا ڈھیہ پنڈت کی بات بیچ میں رہ گئی"، میں نے دادی کی طرف غور سے دیکھا۔

میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ آگے بڑھ گئی:

ہماری دوسری بچی میرے پیٹ میں تھی کہ بھاگیرتھ کو انجانی بات پھر پکارنے لگی۔ میں نے اسے نہیں روکا۔ بے شک اِس بار مجھے اپنی نال سبزی کاٹنے والے چاقو سے خود کاٹنی پڑی۔ دایہ یا نرس کو بلانے کی فیس کہاں تھی میرے پاس۔ دو جون کھانا مل جائے یہی غنیمت تھا۔

دادی چونک پڑی:

میں اپنا دکھڑا لے بیٹھی۔ بات صرف بھاگیرتھ کی ہے۔ تم جانتے ہو لوگ کیا کچھ نہیں کرتے کیا کچھ نہیں سہتے بات پھر بھی اُن کی نہیں کسی اور کی رہتی ہے۔ بھاگیرتھ بھی یہی کہتا:

بات افلاطون کے فلسفی راجہ اور نتشے کے مہا پُرش سے آگے نہیں بڑھتی۔

چار سال بعد لوٹا تھا تیرا دادا۔ وہی میلا چہرہ، تھکا جسم، زخمی وجود۔ کندھے سے لٹکتا تھیلا۔ وہی میں، اس کے نام کی روٹی بیلتی ہوئی۔ وقت کو ٹھیلتی ہوئی بچی کو گود میں ڈالے دروازے پر نظریں جمائے بھاگیرتھ کی دستک کے انتظار میں بیٹھی۔

اِس بار تھیلے میں سوائے ایک انسانی کھوپڑی کے کچھ نہ تھا۔

"میں اسے شمشان سے نہیں اُٹھا لایا"، بھاگیرتھ ہنسا۔

اِس بار سفر لمبا بھی تھا اور سخت بھی۔ پہاڑ کے اُس پار کا دیش اور بھی عجیب نکلا، سرکٹوں کی بستی۔ کباڑی کی دکان میں کھوپڑیاں ہی کھوپڑیاں۔ باقی دکانوں کی چمک دمک اور سج دھج سے دھیان ہٹا کر میں کھوپڑیاں دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ اچانک میرے دل میں ہوک اُٹھی —— ان کھوپڑیوں میں میری بھی ہے کہ نہیں —— ابھی کباڑی کا ہاتھ میری طرف بڑھا۔ اُس نے ایک کھوپڑی میرے جھولے میں ڈال دی۔ دوسرے ہی لمحے کئی سر کٹے میرے گرد گھیرا ڈال کر ناچنے لگے۔ مجھے لگا میں بھی اُن کے ناچ میں شریک ہو گیا ہوں اور ۔۔

دادی کے خاموش ہوتے ہی میں بے چین ہو اُٹھا:

سرکٹوں کی پوری کہانی سناؤ۔

دادی چکلے پر پڑی روٹی کی سلوٹ نکالنے لگا:

بھاگیرتھ نے مرنے والی بچی کو یاد کیا نہ اُس کے بعد آنے والی سے موہ جتایا۔ وہ تو پانڈولپی

میں نیا پنا جوڑتے ہی نئی یاترا پر نکل پڑا :

تم پانڈولپی کا خیال رکھنا۔ کوئی الماری کھول کر اٹھا نہ لے جائے۔

اِس بار میں نے وقت کا خیال نہیں کیا۔ پروان چڑھتی بچّی کی بڑھتی خواہشوں کے ساتھ بڑھتے خرچ کو پورا کرتی کہ......

زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ لوگ اپنائیت سے بے گانہ ہوتے جا رہے تھے۔ تنگدستوں کی گنتی میں اضافے کی رفتار تیز تر تھی۔ مجھے کام ڈھونڈنے میں مشکل پیش آنے لگی۔ ماں باپ کے لیے اپنی جان اور اپنی اولاد کی جان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اپنا کیلا ہے۔ آدمی کسی بھی طرح کاٹ لیتا ہے۔ اولاد کے لیے سپنے بُننے اور انھیں پورا کرنے میں کچھ بھی.....

دادی جھنجھلا اٹھی :

پھر وہی بات۔ بھاگیرتھ کو بھول اپنی ذلت.....

وہ لوٹ آیا۔ اپنے جھولے میں ایک گھونگھا لایا :

جانتی ہو اس بار میں کرم ناشا ندی کے ساتھ ساتھ چلتا سمندر تک جا پہنچا۔ ندی پہلے بڑی تیزی سے بڑھتی گئی جیسے سمندر کے ہجر میں پاگل ہو لیکن جوں جوں سمندر نزدیک آتا گیا ندی کی رفتار مدھم پڑتی گئی۔ اپنے سامنے بازو پھیلائے سمندر کو دیکھ کر تو وہ ٹھٹک ہی گئی جیسے سوچ رہی ہو کہ وصال اور ہجر کے چکر سے نکل کر اس کے اپنے پاس کیا رہ جائے گا۔ سمندر کی مُسلسل پکار، ندی کا خاموش انکار۔ دونوں کے بیچ پڑا یہ گھونگھا...

دادی خاموش ہو کر چولہے میں ہلکی پڑتی آگ کو دیکھنے لگی تو میں کسمایا :

گھونگھے کی داستان بھی تو سناؤ۔

دادی نے لکڑی کا بُرادہ چولہے میں ڈالا اور آگے بہہ نکلی :

ہوا کا رُخ دیکھ کر بات کرنے والے سے بچو۔

مقتل کا دربان سب کا پتہ جانتا ہے۔

قبرستان ساتھ ساتھ چلتا ہے شمشان میں ہم ہی نہیں جلتے۔ ہونی سے بچ نکلنے میں کوئی لابھ نہیں۔

بھاگیرتھ ان گنت یاتراؤں کے دوران پتہ نہیں کیا کچھ اکٹھا کر لایا۔ پانڈولپی میں سب لکھا ہے۔

دادی ذرا دیر کو رُکی :

اب مجھ پر دو زندہ اور ایک مُردہ لڑکی کا بوجھ تھا۔ زندوں کے ساتھ زندگی گذارنا اتنا مشکل نہیں جتنا مرنے والوں کی یاد میں مرتے چلے جانا۔ بے نام اور بے کفن چلی جانے والی بچّی مجھے دیمک بن کر چاٹتی رہی اور دونوں زندہ لڑکیاں میٹھے کیڑے بن کر۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلوانا ان کی اچھے گھروں میں شادی کرنا مجھ پر آندھی کی طرح چھاتا بڑھاپا۔ میں نے ہمّت نہیں ہاری ۔۔۔ اپنے کو کھپاتی رہی۔ لوک لاج نبھاتی رہی ..... بھاگیرتھ بھی یاترا سے بیمار لوٹنے لگا۔ اُس کے آنے سے پہلے اُس کی دوا دارو کے لیے پیسے کا انتظام۔ گرتی صحت بڑھتا کام .....

دادی کے ہونٹوں پر اُداس مُسکراہٹ پھیل گئی :

یہ سب تو ناٹک کی تیاری کا معاملہ ہے۔ میں خواہ مخواہ ..... بات ہیرو کی ہونی چاہیئے۔

اُس بار لوٹتے ہی بھاگیرتھ نے اپنا جھولا مجھے خود ہی تھما دیا۔ مَیں نے اُس میں سے چاندی کی پازیب نکالی تو اُس کا چہرہ دمک اُٹھا :

پارو! ل کی ماں تُو نہیں جانتی۔ تُو جان ہی نہیں سکتی۔ میں نے میدان، جنگل، پہاڑ، ندی نالے پار کر کے اُس دیش میں قدم رکھا جہاں کے لوک گیت سُننے کے لیے دیوتا آکاش سے دھرتی پر اُتر آتے ہیں۔ کیا تُو نے اپسرائیں دیکھی ہیں ؟ کاش تُو میرے ساتھ ہوتی !

"پاپی راجہ، دُشٹ منتری !" دوسرے ہی پل بھاگیرتھ اُداس ہو گیا :

اُنھوں نے رات کو دربار میں لوک گیت اور لوک نرتیہ کی محفل جمائی۔ مجھے سنگیت اور سُندرتا میں اپنی سُدھ بُدھ جاتی۔ لیکن مٹیاروں نے ابھی چند بول مُنہ سے نکالے تھے۔ اُنھوں نے چند قدم تال پہ اُٹھائے تھے کہ راجہ کے مُنہ سے رال ٹپکنے لگی :

"یاتری ! آج تُم بتاؤ ان سُندریوں میں سے کون سی ہمارے یوگیہ ہے ؟"

راجہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سنگھاسن سے اُٹھا اور ناچتی گاتی لڑکیوں میں سے ایک مٹیار کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔

بھاگیرتھ چیخ اُٹھا :

لڑکی کے چہرے پر پھیلی دہشت بھری دحشت ! اُس نے اپنے ایک پاؤں سے پازیب اُتار کر میری طرف پھینک دی یہی پازیب جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ذرا اسے بجا کر تو

دیکھو... نہیں تم نہیں... یہ تو میں ہی...

بھاگیرتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دادی اس بار بھی خاموش ہو گئی تو میں ہلکے سے تلملایا:

پازیب کی آواز کے بارے میں کچھ تو بتاؤ۔

دادی تھی کہ میری نہ سُننے پر تُلی ہوئی۔ وہ پھر بہنے لگی:

کائنات اپنے سے آوب چلی۔ مور اپنے پانو دیکھ کر رو سکتا ہے اُنھیں کاٹ کر نہیں پھینک سکتا۔ زندگی اپنا بوجھ ڈھونے سے کب کترائے گی؟

کیا کیا اکٹھا کرتا رہا بھاگیرتھ۔ کیا کیا ہتی سنبھالتی رہی ہیں۔

اس بارے پہلی بار وہ یاترا پر نکلنے سے پہلے بولا:

کاش میرے پاس کیمرہ ہوتا۔ دُنیا کا سارا حُسن بھر لاتا اِس جھولے میں۔ شبد، سُر، رُوپ۔

مَیں نے اُس سے چُھپایا تھا۔ سال بھر پہلے ڈاکٹر نے مجھے چھاتی کا کینسر بتایا تھا۔ آپریشن کو کہا تھا۔ مَیں نے کچھ رقم اُس آپریشن کے لیے بچا رکھی تھی لیکن بھاگیر کے کام میں رُکاوٹ پڑے میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میں نے اُسے کیمرہ خرید دیا۔

آخری بار وہ عجیب حالت میں لوٹا۔ داڑھی اور سر کا ایک بھی بال کالا نہ رہا تھا۔ سب چاندی میں ڈھل گیا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر مسرت اور وحشت کے مِلے جُلے اثرات تھے۔

مجھے اپنی طرف بے چین نظروں سے دیکھتے پاکر وہ بولا:

شکر کر میں زندہ لوٹ آیا۔

اِس بار میں ساندل بار کے علاقے میں جا نکلا۔ راوی اور چناب کے بیچ کا علاقہ۔ جانگلی قبیلے کی جائے پناہ۔ میں قبیلے کے رسم و رواج میں کھو کر رہ گیا۔ اُس کی بولی سیکھنے کی لاکھ کوشش کی لیکن ناکام۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ نوٹ کرتا رہا۔ گنوار لوگوں کی اکھڑ باتیں۔ محبت میں انتہا، نفرت میں انتہا۔ مجھے خوب پیار سے رکھا۔ بات اُس دِن بِگڑی جس دن میں نے کیمرہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔

تم نے نہیں دیکھا ساندل بار کا حُسن۔ مٹیلے رنگ میں گھُلتا سونا۔ عجیب چمک ہوتی ہے گبروؤں اور مٹیاروں کے جوبن میں۔ دُور سے خوشبو آئے نشہ چھانے لگے۔ اُس روز تو شادی تھی۔ دُلہن سجائی جا رہی تھی۔ دُلہن کی سہیلیاں گیت گا رہی تھیں۔ ملن کا گیت۔ سہاگ رات کی مستی میں ڈوبا ہُوا۔

میں اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا کیمرہ نکال اُس سحر انگیز منظر کو قید کرنے کی دُھن، کیمرہ دیکھتے ہی براتی بے چین۔ میں نے بٹن دبایا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے چہروں پر چھائی مستی تیزی سے غائب ہونے لگی۔ اُس کی جگہ وحشت اُبھرنے لگی۔ میرے اندر بھی دہشت بھرنے لگی۔ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ براتی میرے پیچھے بھاگے۔ ویران راستے پر انھوں نے مجھے آلیا۔ میرے گرد کھڑے ہو کر وہ کیمرے کو دیکھنے لگے۔ اپنی زبان میں مجھے برا بھلا کہنے لگے۔ ڈرانے دھمکانے کے ساتھ ساتھ اشاروں سے بتانے لگے کہ وہ مجھے زندہ جلا دیں گے۔

بھاگیرتھ کے چہرے پر گہرا خوف اُبھر آیا:

شکر کرو اُسی دم اُن کا ایک بڑا بوڑھا کہیں سے وہاں آنکلا۔ وہ معاملے کو کہاں تک سمجھا میں نہیں جانتا۔ لیکن اُس کی بات سُن کر وہ لوگ مجھے وہیں کھڑا چھوڑ واپس چلے گئے۔

بھاگیرتھ نے جھولے سے کیمرہ نکالا اور کمرے کی طرف چل پڑا:

تصویر بھی پانڈولپی میں لگا دوں گا۔

دادی کو خاموش ہوتے دیکھ کر اس بار میں چیخ اُٹھا:

مجھے وہ تصویر دکھاؤ۔ گمنام دھیمیندر دت کی پوری کہانی سناؤ اور پازیب کی جھنکار بھی۔ میں وہ انسانی کھوپڑی ضرور دیکھوں گا۔ ادھورے منظر سے من اُوب چلا۔

مجھے اس طرح بے چین ہوتے دیکھ دادی چونک اُٹھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ جلد ہی اُس کی آنکھیں ہلکی چمک سے بھرنے لگیں اور چہرے پر نور کی کرنیں مچلنے لگیں۔ اُس نے اپنے گلے میں پڑی مالا سے لٹکتی چابی الگ کر کے مجھے تھما دی:

الماری میں سے پانڈولپی اور تصویر نکال لاؤ۔

دادی کی نظروں میں عجیب اشتیاق تھا اور آواز میں انوکھا اعتماد۔

میں الماری کے سامنے پانڈولپی اور تصویر تھامے کھڑا رہ گیا۔ آخر دھیرے دھیرے چلتا ہوا میں دادی کے پاس پہنچا تو وہ دھیمی آواز میں بولی:

”کیا ہوا؟“

”دادی! پانڈولپی تو کوری پڑی ہے۔“

”کیا کہا؟“ دادی ہڑبڑا اُٹھی۔ ”اور پازیب؟“ اُس کی آواز سہم گئی۔

"پازیب گونگی ہے"

میں نے تصویر دادی کے ہاتھ میں تھما دی۔

تصویر کو دیکھتے ہی دادی کانپ اُٹھی:

بھاگیرتھ کی تصویر! بھاگیرتھ کی دھندلی اور کٹی پھٹی بکھری تصویر!!

تصویر کو ایک طرف رکھ کر دادی دُکھ کے اتھاہ ساگر میں اُترنے لگی۔ اُس کی چمکتی آنکھیں ویران ہونے لگیں اور اُس کا دمکتا چہرہ سیاہی میں ڈوبنے لگا۔ دھیرے دھیرے اُس نے دروازے کی طرف پیٹھ پھیر لی اور چکلے پر بیلی پڑی روٹی کو اکٹھا کر کے پرات کے آٹے میں ملانے لگی۔ چولہا بجھانے لگی۔

اُوپر کا پانی

یگ پورا ہوتے ہی چاروں سادھو اپنی اپنی یاترا سماپت کر کے جٹا دھاری برگد کے نیچے آنکھیں موندے پڑی ڈھونی کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ان کے وہاں آسن جمانے سے پہلے کتھا گھاٹ کے پتھر نے کہا "میں یگ یگانتر سے یہاں آ کر کتھا سنانے والوں کو جو بتاتا آیا ہوں، وہ تم چاروں بھی سن لو۔"

سادھوؤں کو اپنی طرف کان لگائے دیکھ کر وہ بولا "تم میں سے جو انتم کتھا سنائے گا مہاتما کہلائے گا۔ باقی تینوں اپنی جٹائیں اس کے چرنوں میں رکھ دیں گے۔" انھیں دُبدھا میں پڑے دیکھ کر پتھر نے ویاکھیا کی۔

"تم میں سے کسی کی بھی کتھا انتم ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے تم میں سے کوئی بھی ایسی کتھا نہ سنا سکے۔ اس دِشا میں تم چاروں کو اپنی جٹائیں برگد بابا کی بھینٹ کرنی ہوں گی۔ اگلے یگ کے آرمبھ تک، تمھیں بیٹھے رہنا ہوگا تاکہ تم کسی اور کو یہ جٹائیں جیت کر لے جاتے ہوئے دیکھ سکو۔"

پتھر کے چپ ہو جانے پر ایک سادھو نے کہا "انتم کتھا کا روپ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں۔"

"تمھارا من سب کچھ جانتا ہے۔" اب کی بار برگد بولا "یہ دھونی، یہ ندی، یہ گھاٹ اور اس کا آس پاس کتھائیں سُنے گا۔ مجھ میں وشواس رکھو۔ اپنی بات کہنا شروع کرو۔"

یہ سُن کر سادھو نے کتھا گھاٹ کو ماتھا ٹیکا اور کہنے لگا۔

"تم تینوں سے بچھڑ کر میں دکشن کی یاترا پر چل پڑا۔ اپنے دیش کے تماشوں کو

دیکھتا ہوا امرپاتال جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ دوسرے دن وہ مجھے راج دربار میں لے گئے۔ محل میں اپنے سے بہت کم عمر کی رانی کے ساتھ اپنے سنگھاسن پر بیٹھا راجہ مجھے دیکھ کر چونکا۔

"تم رُدراکش کی مالا کا مطلب سمجھتے ہو۔ بدن پر ملی بھبھوت کی مہانتا جانتے ہو۔ تم کرنی والے سادھو اور سِدھ پُرش ہو۔ میری اِچھّا پوری کرو۔" مجھے آنکھیں بند کر کے چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ بولا:

"مجھے وردان دو کہ میری واسنا اگنی سدا بھڑکتی رہے میری ولاس یاترا کا کبھی انت نہ ہو۔" مجھے پھر بھی چپ کھڑا دیکھ کر وہ چلایا۔

"اگر تم نے میرے دس گنتے گنتے مجھے وردان نہ دیا میں تمھیں اپنے داس داسیوں کے ساتھ پتھر ڈھونے پر لگا دوں گا۔" میں پھر بھی نہیں بولا۔ سپاہیوں نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ میں اُس چنڈال کے بارے میں بہت کچھ سنتا ہوا پتھر ڈھونے میں جُٹ گیا۔" دھونی کو چرچراتے سن کر سادھو پر سَن چت ہو گیا۔

"راجہ کی یہ چوتھی رانی تھی پہلی تین رانیوں کو اس نے اُبلتے تیل سے بھرے کڑاہے میں ڈال دیا تھا۔ اُن کے شریر سے واسنا کی گندھ آنی بند ہو گئی تھی پھر اس نے اپنی جوان کنیا کے ساتھ نرک بھوگ کر اُس کی جان لے لی۔ اس کے بعد اُس نے اپنے بیٹے پر نظر ڈالی جس نے بڑے جتن سے اپنی جان بچائی۔" سادھو نے آس پاس نظر دوڑائی۔

"چوتھی رانی نے بوڑھے راجہ کو بس میں کر لیا۔ اُس نے اُسے اپنے لیے محل بنوانے کو کہا جو کسی مندر کی طرح کلا پورن اور پوتر ہو۔" برگد کے پتّوں کو سرسراتے دیکھ کر سادھو جھومنے لگا۔

"راجہ کے لیے یہ کام کٹھن تھا۔ مورتی کار اور کاریگر اُس کے لیے پاپ محل بنانے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن اُس پاکھنڈی نے گھوشنا کر دی کہ وہ مندر بنوانا چاہتا ہے۔ اپنے پاپ دھونے کے لیے پُن کمانا چاہتا ہے۔ یہ سن کر سنسار کے پرسِدھ کلاکار اُس کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ راجہ نے اُنھیں بے شمار دولت دینے کا وچن دیا۔ اس کے بعد اُس نے دیش بدیش کے مندروں اور کلا استھانوں سے پتھر اور مورتیاں چرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے۔ اُن میں سے ایک میں تھا۔"

"مندر بن گیا۔ راجہ خوش ہوا اور اُس نے کلاکاروں کے ہاتھ کٹوا دیے۔ اُسی رات جب وہ رانی کے ساتھ محل میں گیا اُس کے بیٹے نے اپنی نئی ماں کے ساتھ مل کر اُس کی ہتیا کر دی۔ اب وہ ماں بیٹا پتنی پتی بن کر رہتے ہیں۔ راجہ کے مرنے کا مجھے یہ لابھ ہوا کہ میں یہاں آگر تمھیں کتھا سنا سکا۔"

سادھو کے خاموش ہوتے ہی گھاٹ کے پتھر نے برگد کی طرف دیکھا۔ برگد بولا، "یگوں پہلے بازی جیتنے والا مہاتما کہتا تھا — انتم کتھا یگ یگانتر چلتی رہتی ہے —"

برگد کی بات سن کر دوسرے سادھو نے اپنے گورو کو یاد کیا۔ ندی کی مچلتی لہروں کو پرنام کر کے وہ کہنے لگا —

"آتر دشاہیں چلتے چلتے میں اُس دیش میں جا پہنچا جہاں کا راجیش اور کیرتی کے لیے مشہور تھا۔ وہ دیاوان اور سادھو سنتوں کا سمّان کرنے والا تھا۔ مجھے اپنے محل کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ننگے پاؤں بھاگا آیا۔ اندر لے جا کر اُس نے مجھے سنگھاسن پر بٹھایا۔ میرے پیر دھو کر چرن امرت پیا۔ کئی طرح سے میرا آدر ستکار کرنے کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا —

"پربھو مجھے دیکشا دو۔"

"راجن کیا کہتے ہو؟ تمھاری عمر راج بھوگنے کی ہے۔ تم اپنی پرجا کا کلیان کرتے رہو۔ اسی میں تمھاری مکتی ہے۔"

"نہیں مہاراج۔ مجھے اپنی شرن لیجیے۔ بندھن سے مکت کیجیے۔"

اُس کے نشچے کو دیکھ کر میں نے اُسے دیکشا دی۔ سکھ دکھ سے مکت ہونے کی بدھی بتائی۔" سادھو نے دیکھا ندی کی لہریں اُچک اُچک کر اُس کی بات سن رہی ہیں۔ گھاٹ کا پتھر مسکرانے لگا ہے۔ اپنے میں مست ہو کر وہ بولتا گیا۔

"راجہ سب کچھ تیاگ کر جنگل کو چلا گیا۔ گھور تپیا کرنے کے بعد لوٹا۔ مجھے لگا وہ کام، کرودھ، موہ، لوبھ، اہنکار سے مکت ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کا آخری امتحان لینے کی سوچی۔ اُسے ایک پھول دے کر کہا کہ وہ اسے تالاب والے مندر کے دیوتا پر چڑھا آئے۔ راجہ چل پڑا۔

دھوپ تیز تھی۔ راستہ دھول سے اٹا ہوا تھا — تھوڑی دوری پر دھول

یں کوئی لال رنگ کی چیز چمک رہی تھی۔ راجہ ٹھٹکا۔ انمول رتن ہے۔ وہ مسکرایا اور اپنے کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ میں نے ان گنت رتن تیاگ کر من کو جیتا ہے ـــــ تھوڑی دُور جاکر وہ پھر رکا ـــــ ایسا رتن میرے پاس کبھی نہیں تھا ـــــ اُس کے من نے اُسے دھوکا دیا۔ وہ لوٹا۔ رتن کو اُٹھانے کے لیے اُس نے ہاتھ دھول میں ڈال دیا۔ اُس کی آتما شنّ ہو گئی۔ وہ رتن نہیں پان کی پیک کا بلبلہ تھا جو سورج کی تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔ اُس سے اپنی ہار سہی نہ گئی۔ وہ بھاگا اور تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔" سادھو نے آہ بھری۔

"بھوسا گر سے پار اترنے کی اچھا میں لین اُس راجہ کو عین کنارے پر پہنچ کر ڈوبتے دیکھ میرا من اشانت ہو گیا اور میں کتھا گھاٹ کے لیے چل پڑا۔" سادھو خاموش ہو گیا۔

کتھا گھاٹ کے پتھر نے دوبارہ برگد کی طرف دیکھا۔ برگد بولا۔

"بہت پہلے آنے والا مہاتما کہتا تھا ـــــ انتم کتھا یا سا پار کا بھید بتاتی ہے۔ دلش کال سے مکت ہوتی ہے۔"

برگد کی بات سن کر تیسرے سادھو نے اپنے گورو کا دھیان کر کے کہنا شروع کیا ـــــ

"پورب کے ایک دیش میں تھوڑا سمے بتانے کے بعد میں آگے جانے لگا۔ ایک پندرہ سولہ سال کا بالک میرے پاؤں سے لپٹ گیا ـــــ ہے ناتھ! مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اس عمر میں ہی سب کچھ دیکھ لیا۔ میں جیون کے نرک کنڈ سے نکلنا چاہتا ہوں ـــــ"

بہت سمجھانے پر بھی وہ نہیں مانا۔ میرے ساتھ گھومتے پھرتے اُس نے میری سیوا میں دن رات ایک کر دیا۔ اُس کی بھگتی سے خوش ہو کر میں اُسے کایا مایا کا بھید سمجھانے لگا۔ وہ بدھی مان بالک جلدی ہی یوگ اور گیان میں سدھ ہو گیا۔ میں نے اسے اپنا اُترادھیکاری مان لیا۔ وہ میری آگیا لے کر گیان کا پرکاش پھیلانے کے لیے چل دیا ـــــ" سادھو نے دیکھا ہوا اپنی چال بھول کر اُس کی بات سننے لگی ہے۔

"لیکن سمے بیتتے وہ اپنے آپ کو بھولنے لگا۔ اُس کا گرم لہو اُسے اپنی یاد دلانے لگا۔ اور اُسے گناہوں کے اندھ کار میں لے گیا۔ استری بھوگ اور مدرا پان نے اُسے اندھا کر دیا۔ پرکاش پھیلانے کے لیے جو گیان اسے ملا تھا، اسے وہ واسنا کی

بھوک مٹانے کے سادھن جٹانے کے لیے کام میں لانے لگا۔ اُس کی لگن اور شردھا میں دراڑ آجانے کے کارن جب اُس کی آتما پوری طرح نشٹ ہونے کو تھی آسے اپنی بھول کا پتہ چلا۔ اب وہ اتنا پچھتایا کہ اُس نے چاول کی بھوسی کے ڈھیر کو آگ لگا کر اُس میں تل تل جل کر مرنے کا نشچہ کیا مجھے یہ سماچار ملا میں بھاگا بھاگا اُس کے پاس پہنچا۔ لیکن وہ آخری سانسوں پر تھا مجھے دیکھ کر وہ مُسکرایا اور اُس نے پران تیاگ دیئے۔ اپنے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی کتھا سُنانے کے لیے میں یہاں آگیا۔" سادھو نے دیکھا ندی اپنے میں مگن ہوگئی۔ دُھونی پہلے کی طرح ادنگھنے لگی۔ ہوا اُس سے بے پرواہ ہو کر اپنی رفتار سے چلنے لگی۔

اب کی بار تیسرے نے برگد کی طرف دیکھا تو وہ بولا ——

"پچھلے سارے مہاتما ایک بات پر سہمت تھے —— بھرم ہی انت کتھا کا جنم داتا ہے ——"

برگد کی بات سُن کر چوتھے سادھو نے سر پہ لٹکتی اُس کی داڑھی کو نوچنا شروع کیا۔ پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے سے کہیں دُور دیکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر تینوں سادھو چلائے —— "اپنی کتھا شروع کرو۔ رات کا یہ انتم پہر ہے ——"

چوتھے سادھو نے آنکھیں کھولیں اور بولا —— "رات کی عمر نہیں ہوتی۔ اِس کو پلوں میں بانٹنا ہماری بھول ہے۔ ساری بات رات ہی کی ہے۔ اندھے اور بہرے یگوں سے بھیانک اور کچھ نہیں۔ انھیں پار کرنے میں کتھا ہی ہماری سہائتا کرتی ہے۔" وہ برگد کی داڑھی کو دُھونی میں ڈال کر جلانے لگا ——

"کتھا نہ ہو تو سب کچھ راکھ جیسا ہو جائے۔ دُھونی ہوا میں بکھر جائے۔ رُت اپنے نکھار کو بھول جائے۔" برگد کی داڑھی کی راکھ کی ایک ایک چٹکی تینوں سادھوؤں میں بانٹنے کے بعد وہ بولا ——

"یہ میری انتم کتھا ہے مجھے ایسا نہ لگتا تو میں یہاں نہ آتا۔" وہ اپنے اندر اُترنے لگا۔ "تم سے بچھڑ کر میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو دائیں ایڑی پر گھمایا۔ رُکنے کے بعد جس دِشا میں میرا مُنہ تھا اُدھر چل دیا۔ دِشاہین ہوئے بنا بات نہیں بنتی۔ اِس بار میں سمندر سے اِدھر کہیں نہیں رُکا۔ اِدھر نے پہلے بھی مجھے وہ کچھ نہیں دیا تھا جو میری پیاس بجھا سکتا۔ جگیا سا بہت بڑی چیز ہے۔ یہ آدمی سے انت تک کی

یاترا کیے بنا چین نہیں لینے دیتی۔ انت کہاں ہوتا ہے یہ سب کی اپنی اپنی سمیا ہے اور سمیا ہماری شکتی کا ایک روپ۔" دھونی کو کروٹ بدلتے دیکھ کر وہ پاس بیٹھے بندر کی پیٹھ سہلانے لگا۔

"بندرگاہ سے چلنے والے انتم جہاز میں میرے چڑھتے ہی ملاحوں نے بادبان کھول دیئے۔ سب لوگ میرے آس پاس آ کھڑے ہوئے۔ وہ مجھے کہیں بھی لے چلنے کے لیے کہنے لگے۔ جس جگہ وہ رہتے تھے وہاں سوائے اکتاہٹ کے کچھ نہیں بچا تھا۔ منترو ابھی ندی اور رمتے جوگی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔" سادھو تاروں کو آنکھیں ملتے ہوئے دیکھ کر ہنسا۔

لیکن مجھے ادھر ہی جانا تھا جس دشا میں میں چل چکا تھا۔ اس لیے ان سب نے سمجھ لیا کہ یاترا کتنی کٹھن ہو اپنے اندر آن دیکھا سکھ رکھتی ہے۔" دھونی کو جاگتے دیکھ کر وہ رکا۔

"میں جھوٹ نہیں کہتا انہونی کو ہوتے ہوئے دیکھنے کی اچھا بڑی وچتر ہوتی ہے۔ سمے کو کینچلی اتارتے اور استھان کو پہلو بدلتے ہوئے دیکھنا کسی کے بھاگیہ میں ہوتا ہے۔" وہ ندی کی لہروں کو تھکا گھاٹ سے سر پٹکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

"لیکن میں نے کہا ہے کہ انتم بودھ ہر کسی کی اپنی شکتی کا نام ہے۔ دن پر دن بیتنے پر بھی کسی کو کچھ انوکھا دکھائی نہیں دیا تو سب نراش ہو گئے۔ ان کی آنکھیں میلی ہو گئیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ جب سمندر کا رنگ گدلا ہو گیا۔ اس میں پہر یل رنگ بدلتے آکاش کی چھایا پڑنی بند ہو گئی۔ چاروں دشاؤں میں کوئی ہلچل نہ رہی تو ملاحوں نے بادبان سمیٹ لیے۔ وہ میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔" سادھو نے دھونی کی بڑھتی ہوئی آنچ کو محسوس کر کے کہا۔

"لیکن میں نے ساہس نہیں چھوڑا۔ واپس جانے کی بجائے اس سناٹے میں کھپ جانا اچھا سمجھا۔ چھوٹی سی کشتی پانی میں اتار کر اس میں کود گیا ——— کئی بار دنیا ایک ہی آدمی کے سہارے چلتی رہتی ہے۔

تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے دیکھا سمندر کا پانی اور گدلا ہو گیا ہے۔ وہ تیل جیسا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے پیاسے ہونٹوں کو بھگونے کے لیے چلو بھر پانی اٹھایا۔ میرے اچرج کی سیما نہ رہی ——— پانی خشک تھا ——— لیکن میرا من مسکرا رہا تھا۔" گھاٹ کے پتھر کو خوش ہوتے دیکھ کر سادھو نے کہا۔

"بھانتے ہو ایسی حالت میں کون ہماری سہایتا کرتا ہے؟" تینوں سادھوؤں کی طرف دیکھ کر وہ ہنسا، "کچھ نہ کرتے ہوئے بھی میں نے دیکھا کشتی چل رہی ہے۔ رانت میں ایک دن میں اس مٹیالے ٹاپو پر جا پہنچا جہاں میں نے وہ دیکھا جو تمھیں بتاؤں گا۔

ٹاپو پر اُتر کر میں نے دیکھا دھرتی، سمندر اور آکاش کا رنگ ایک ہے۔ دُور دُور تک راکھ ہی راکھ۔ جیسے یگوں پہلے وہاں کا سب کچھ جل گیا ہو۔ جگہ جگہ ابھرے ہوئے راکھ کے ٹیلے دریں سے ایک پر چڑھ کر میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ کہیں کوئی پیڑ پودا، جیو جنتو دکھائی نہیں دیا۔ ہوا کو ٹھہرے ہوئے اور واتاورن کو بے رس دیکھ کر بھی میں نے دل نہیں چھوڑا ــــ اکتاہٹ کیسے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔" وہ آگ کو سانپ کی طرح زبان لپلپاتے دیکھ کر مسکرایا۔

"دوسرے دن میں ٹاپو کے اندر کی طرف چل دیا۔ کوسوں چلنے کے بعد مجھے دُور جیون کا پہلا نشان دکھائی دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا ایک ناری اور اس کا پتی کھڑے کالی دھرتی کو بڑی لاچاری سے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا قد ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ مرد کے چہرے پر گنتی کے تین بال تھے۔ اُس کی گنجی کھوپڑی پر گُمّلی جیسا اُبھار تھا۔ ناری کی ٹانگیں پُرش کی ٹانگوں کی طرح ٹیڑھی تھیں۔ اُس کے ہاتھ مُڑے ہوئے تھے۔ اُس کی بے نام چھاتی سے لٹکتا بچہ مینڈک جیسا تھا ــــ اُس کا جثہ چھپکلی جتنا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنا اور پاپ پُن کا سوچنا!" سادھو نے لمبی سانس لے کر آس پاس اکٹھے ہوئے چرندوں پرندوں پر نظر ڈالی۔

"اُنھوں نے مجھے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر بے جان سی چیخ ماری اور میرے پاؤں سے لپٹ گئے۔ میں نے اُنھیں اوپر دیکھنے کو کہا لیکن اُنھوں نے میرا کہا نہ مانا۔ وہ اُٹھے اور نظریں نیچی کر کے بازوؤں کو رانوں سے چپکا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ مجھے اپنے گاؤں لے گئے۔" برگد کو جھک کر اپنی بات سنتے دیکھ کر سادھو کہتا چلا گیا۔

"وہ گاؤں کیا تھا راکھ کا سپاٹ میدان تھا۔ اُس پر کھڑے سو ڈیڑھ سو نر ناری اور بچے ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے کسی ناسور پر بھنبھناتی مکھیاں۔ مجھے دیکھ وہ دبی دبی چیخیں مارنے لگے۔ اپنی گھٹی گھٹی آواز میں ایک آدمی کو میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے کہنے لگے۔ وہ آدمی سر جھکائے میری ٹانگوں کو کھرچنے لگا۔

"کیا یہ اس ٹاپو کی کُل جن سنکھیا ہے؟" میں نے اُس آدمی کو پرے ہٹا کر پوچھا اور

دُور دُور تک پھیلے بنجر داتادرن کو دیکھنے لگا ـــــ اُس نے آہ بھری اور سر ہلا دیا۔

"کیا اس دھرتی میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے پاؤں کے ناخن سے راکھ کو کریدا۔

سردار نے جھک کر زمین کو ہاتھوں سے کھودا اور اُس میں سے تنکے جتنی موٹی گانٹھ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی ـــ

"تم نے اِس دھرتی کی کوکھ کو بانجھ کر دیا ہے۔ اِسی لیے تمہاری یہ دُردشا ہے۔" میں کرودھ سے بولا۔

میری بات سُن کر اُس آدمی نے اپنے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب مجھ سے مُنہ پھیر کر کھیتوں کو سنوارنے میں جُٹ گئے۔ جیسے وہ اُنھیں لڑائی کے لیے تیار کر رہے ہوں۔ مَیں نے تنکے کو مُنہ میں ڈالا وہ مُردہ داتادرن کی طرح پھیکا تھا۔ "ندی کو تر گئے، گھاٹ کو آنکھیں کھولے، برگد کو آہیں بھرتے دیکھ کر سادھو نے آگے کہا۔

"کئی دن میں اُن لوگوں کو دیکھتا رہا۔ وہ بلا کے محنتی تھے۔ رات دن راکھ کو اُپجاؤ بنانے میں جُٹے رہتے۔ لیکن سوائے تنکے جیسی جڑ کے کچھ پیدا نہ ہوتا۔ اُن کی اس حالت کو دیکھتے اور اس کا کارن کھوجتے ہوئے میں چِنتا میں ڈوبا رہتا ـــــ یہ لوگ کون سے پاپ کی سزا بھوگ رہے ہیں۔ کیا میں انھیں اس نرک سے نکال نہیں سکتا۔ سب کچھ کرتے ہوئے بھی کچھ نہ ملنے سے زیادہ دُکھ دائک بات اور کیا ہو سکتی ہے ـــــ یہی سوچتے ہوئے میری آنکھیں آکاش کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اندھے سورج کو دیکھ کر میرا دل کانپ اُٹھتا ـــــ ضرور کبھی نہ کبھی اِس ٹاپو پر رہنے والوں نے کوئی پاپ کیا اور پرلے نے انھیں پوری طرح نشٹ کر دیا۔ یہاں بہتے جھرنوں کو مُردہ بھومی نگل گئی ـــــ یگوں بعد پیدا ہونے والی یہ نسل بھی اندھی، بہری اور انتم سچ سے بیگانہ ہے۔ یہ لوگ اوپر کو مُنہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟ بازوؤں کو نیچے کیوں لٹکائے رکھتے ہیں؟؟ یہ دھرتی محنت کا پھل کیوں نہیں دیتی؟؟؟

اُس نے برگد کو آنسو بہاتے دیکھا اور رچپا ـــــ

"ایک رات مجھے وچار آیا کہ میں نے اُس پانی کی طرف دھیان نہیں دیا جس سے یہ اپنے کھیت سینچتے ہیں۔ میں سمندر کے خشک پانی کو یاد کر کے کانپ اُٹھا۔ اُسی سمے پاس والے کوئیں کا پانی چکھا۔ وہ کھاری اور کڑوا تھا ـــــ یہ تو دھرتی کو صرف نمک دے سکتا ہے۔ جیون کا ناش کرنے والے اس پانی کے ہوتے ہوئے دھرتی کی کوکھ کیسے

ہری ہو سکتی ہے ؟ میں دل ہی دل میں چلا آیا — میرے من میں آئی کہ ان کے لیے پرارتھنا کروں — پر لار تھنا ان بے چاروں کو اس کا گیان نہیں۔ پرکھوں کا پاپ ان کے سروں کو جھکائے رکھتا ہے۔ کہیں یہ اوپر کی طرف دیکھ سکتے ! آکاش اور دھرتی کے رشتے کو سمجھ سکتے ؟ ! آکاش ہی دھرتی کی پیاس بجھا سکتا ہے اور آکاش ہی پرارتھنا کا بول سنتا ہے — پرارتھنا — !

"کانپتے ہاتھوں اور ہانپتی آواز میں میں نے ان گھناؤنے لوگوں کو جگایا اور انھیں اپنی نقل اتارنے کا کہہ کر دونوں ہاتھ اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ میں نے دیکھا ایسا کرتے ہی پرارتھنا کے شبد ان کے ہونٹوں پر تھرکنے لگے اور ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ آکاش کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے واتاورن مسکرانے لگا۔ دوسری صبح دور دور تک سبزہ پھوٹ رہا تھا۔ ٹاپو ان گنت رنگوں کو پہن رہا تھا۔" مہاتما نے اپنے پاس ایک ساتھ بیٹھے نیولے اور سانپ کو دیکھ کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے اور بولا:

"کیا تم جانتے ہو کتھا کب شلوک کا روپ دھارن کرتی ہے۔" اس کے یہ کہتے ہی دھونی سے پھوٹتا ہوا دودھیا اجالا دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔

ڈاکٹر

ڈاکٹر راز داں نالم نکلا۔

بھارت اسی دن سے ہسپتال کے چکر لگانے لگا تھا جس دن اسے اپنے گلے کی دائیں گلٹی میں پہلی بار چبھن کا احساس ہوا۔ نوکیلے درد پر غور کرتے ہوئے وہ پسینے میں ڈوب گیا اور بڑی بے بسی سے خلا میں تیرتی اپنے دادا کی آواز سننے لگا۔

"ہمارے خاندان کو شراپ ہے کہ یہ نسل در نسل ایسی بیماری کا شکار رہے گا جس کا علاج وقت کے پاس بھی نہیں ہوگا"

اس کی آنکھوں کے سامنے ماں باپ اور بہن کے چہرے ابھرنے لگے۔ وہ اپنے باپ کی ہانپتی کانپتی آواز سننے لگا:

"لوگ پیچیدہ بیماریوں کی بات کرتے ہیں میں کہتا ہوں نزلے جیسی معمولی بیماری کا بھی علاج نہیں۔ شروع سے آج تک اسے لا علاج مانا گیا۔ ویسے ہر روگ کا کارن نزلہ ہی ہے۔ شریر کے جس حصے پر گرتا ہے اسے جلا ڈالتا ہے۔ شریر کا وہ انگ کسی نہ کسی بیماری کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ وہی روگ اس کی موت کا پیغام لاتا ہے"

بھارت نے گلے کی گلٹی کو دبایا:

میرا باپ جانتا تھا نزلے کا اثر دھیرے دھیرے ہوتا ہے لیکن اسے اس کے جان لیوا ہونے میں شک نہ تھا۔ اس نے اپنی صحت کی چنتا نہ کی ہو لیکن ماں اور بہن کا علاج کرانے میں پیچھے نہ رہا۔ ان کی سادھارن کھانسی ٹی۔ بی بن گئی۔

بھارت جھلّایا :

"ڈاکٹر پہلی بار ہی بیماری کا پتہ کیوں نہیں لگاتا۔ ٹھیک دوائی دینے میں اتنی دیر کیوں لگاتا ہے۔ جب تک اُسے اصل روگ کا پتہ چلتا ہے، روگی کا شریر دوا کے قابل نہیں رہتا۔

"ڈاکٹر جانتا تھا میری ماں اندھیرے سڑاندھ بھرے واتاورن میں پیدا ہوئی۔ وہ بھوکی پیاسی رہی۔ باپ کے پاس غریبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لگاتار کم کھانے اور چنتا میں ڈوبی رہنے سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ آخر تپ دق نے اُس کی جان لے لی۔

"باپ نے بھی تو بھول کی۔ ڈاکٹر کی رائے کیوں نہ مانی۔ دیر سویر ہی سہی ڈاکٹر کو روگ کا پتہ تو چل گیا تھا۔ اُس کے کہنے پر ماں کا آپریشن کیوں نہ کرایا۔ ایک پھیپھڑا نکال دینے میں بھلائی تھی۔ اُس پر دھیان کیوں نہ دیا۔ بے چاری دوسرے پھیپھڑے کے سہارے جی لیتی۔

"پتہ نہیں باپ چیر پھاڑ سے اتنا کیوں ڈرتا تھا۔ بہن بھی بچ سکتی تھی۔ اناپ شناپ دوا دینے سے بھلا کینسر جیسے روگ کا علاج ہو سکتا ہے؟ ایک طرف چھاتی میں روگ کے ظاہر ہوتے ہی اُسے کاٹ کر الگ کر دیا جاتا تو لڑکی بچ جاتی باپ نہیں مانا۔ وہ ہر طرح کا علاج کرانے کے لیے تیار رہتے ہوئے بھی شریر کی کانٹ چھانٹ سے گھبراتا رہا——

کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ آدمی کا کوئی انگ کاٹے بغیر اُسے روگ سے چھٹکارا دلایا جا سکے۔ مجھے آدھے ادھورے لوگوں سے چڑ آتی ہے۔ ایک چھاتی والی لڑکی! بھگوان نے جس کو جیسا پیدا کیا ہے اُسے اُسی روپ میں جیون بتانا چاہیئے۔ ہمیں کوئی ادھیکار نہیں کہ ہم قدرت کے بنائے ڈھانچے کو توڑیں۔ ٹنڈ منڈ آدمی اپنے میں گرا گرا سا رہتا ہے۔ ایک پھیپھڑا، ایک آنکھ، ایک ٹانگ، ایک چھاتی۔ شریر کو ادھورا بنا دینے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں اپنی بیٹی کی کٹی پھٹی لاش کا کریا کرم کرنے کا پاپ نہیں کر سکتا —— کیسا آدمی تھا! دمے سے مرا۔ بیماری نے سوچ کا ستیاناش کر دیا۔"

اگیانی باپ کی مُورکھتا پر وچار کرتے ہوئے بھارت کانپ اُٹھا اور اپنے گلے کی گلٹی پر اُنگلی پھیرتے ہوئے دفتر سے چھٹی لے کر سیدھا ہسپتال جا پہنچا۔

اُسے کیا خبر تھی ڈاکٹر راز داں اتنا بے رحم ہے، ورنہ وہ اُس سے مشورہ نہ کرتا۔

لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ شروع میں وہ بار بار ہسپتال جا کر دیواروں پر لٹکتے بورڈ

بڑھتا رہا۔ اُن پر لکھے ہر روگ کو اپنے اندر رکھو جتا رہا۔ دل کی بیماری اور کینسر کا ذکر بار بار کیا گیا تھا۔

دل تو ٹھیک ہے۔ اس پر بھارت کو وشواش تھا۔ نہ یہ کمزور رہوا نہ اس میں دراڑ آئی نہ کبھی سینے میں بائیں جانب درد اُٹھا نہ بایاں بازو ہی سُن ہوا نہ خون کا دباؤ زیادہ گھٹا بڑھا۔

بھارت جانتا تھا اُس کا دل بڑے سے بڑا صدمہ سہہ سکتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اُس کا بیمار خاندان آج تک نہ چلتا رہتا۔ لیکن بات گلے کی گلٹی کی تھی۔ اُس کا درد بھلائے نہ بھولتا۔ وہ یہ مان بیٹھا کہ اُس کی بھوک مر گئی ہے اور ہاضمہ بگڑ گیا ہے۔ پیشاب بھی بار بار آنے لگا ہے۔ معمولی سا کام اُسے تھکا دیتا ہے۔ شاید وزن بھی کم ہو گیا ہے۔

وہ بار بار ہسپتال جاتا اور بورڈ پر نظریں ٹکا دیتا ——— کینسر کے روگ کی نشانیاں ظاہر ہوتے ہی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے۔ یہ روگ پہلی سٹیج پر آسانی سے قابو میں آجاتا ہے۔ دیر ہونے پر روگی کو بچایا نہیں جاسکتا ہے۔ ہمارے دیش میں مرد اکثر گلے اور مُنہ کے کینسر سے اور عورتیں چھاتی اور رحم کی رسولی سے مرتی ہیں۔

بھارت سٹ پٹانے لگا۔ اُسے پھر بہن کی یاد آئی۔ پیدا ہی روگی ہوئی۔ دیکھ کر دل بھر آتا۔ پھر بھی یہی سوچتے کہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ نئے لوگوں میں جا کر خوش رہے گی۔ اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ لڑکیاں سسرال جا کر ہی جوبن پر آتی ہیں۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ شادی کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا کینسر ہے۔ بہت علاج کیا لیکن روگ چھاتی سے شروع ہو کر ناف کے نیچے تک جا پہنچا۔ یہ موت کا الارم تھا۔ وقت پر آپریشن نہ ہونے کے کارن اُس کا ریشہ ریشہ کینسر کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک دن وہ کلی پھول بنے بنا ہی مُرجھا گئی۔ باپ کے اگیان کی شکار اُس کی سنتان۔ ہم وقت پر کیوں نہیں سمجھتے۔

رازداں کے پاس جانے سے پہلے بھارت کی ہمت اتنی کم نہیں ہوئی تھی۔ ماں اور بہن کی موت نے اُسے اُداس ضرور کیا لیکن جڑ تک نہ ہلایا۔ جب ماں چل بسی وہ موت اور زندگی کا نہیں جانتا تھا۔ ماں کی چتا سے اُٹھتی لپٹیں بھی اُسے موت کا بھیانک روپ نہ دکھا سکیں۔ باپ کو ٹوٹا بکھرا چھوڑ کر وہ شام کو اپنے دوستوں کے پاس چل دیا۔

بہن کی اور بات۔ وہ ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔ بچپن ایک ساتھ گذرا۔ اُس کی آنکھ مچولی نے اُنھیں باندھ رکھا تھا۔ موت اپنے بھیانک روپ میں اُس وقت سامنے آئی جب باپ بھی لمبے سفر پر چل دیا۔ اب معلوم ہوا کہ دادا کی بات میں کون سا بھید چھپا ہوا تھا۔ اُسے

گلے کی گلٹی ڈرانے لگی۔

وہ رازدان کے پاس نہ جاتا تو اتنا نہ گھبراتا۔ باپ کو آپریشن کے نام سے چڑ تھی۔ لیکن بھارت اپنے خاندان کی ہر بیماری سے چھٹکارا پانے کا ذریعہ آپریشن کو ہی سمجھتا۔ ایک انگریزی میگزین میں چھپی رنگین تصویریں بڑے شوق سے دیکھتا۔ اُن میں میڈیکل سائنس کی دلفریب جھلک تھی۔

اتہاس کے وسطی دور میں روگ کے علاج کو گہرے رنگ کی رنگین تصویروں میں چھپا ہوا دیکھنا اُسے بھلا لگتا۔ روگی کو دوا پلانے کے طریقے اُسے چونکا دیتے۔ کئی بار روگی کو چار پانچ آدمیوں نے دبوچ رکھا ہوتا۔ لمبی داڑھی والا کویراج چاقو سے اُس کا روگ والا انگ کاٹ رہا ہوتا۔ آگ میں تپی چھری کی نوک سے گلا سڑا گھاؤ داغ رہا ہوتا۔ روگی کراہ سکتا تھا بلبلا سکتا تھا لیکن اپنے شریر کو سپرد ٹریٹمنٹ نہیں سکتا تھا۔ اُس یُگ میں روگی کو ٹھیک کرنے کے اُپائے کتنے پچھڑے ہوئے تھے۔ آج کل روگی کو پتہ نہیں چلتا کہ اُس کے ساتھ آپریشن کے دوران کیا بیت رہی ہے۔ پہلے تو اُس کے باہر کے گھاؤ کا ہی آپریشن ہوتا تھا۔ اب شریر کے رگ و ریشے کی جانچ کر کے روگ کو جڑ سے نکال دیتے ہیں۔ دل، گردے، یہاں تک کہ دماغ بھی ...

بار بار باپ کو کوستا ہوا وہ جدید سرجری کو سراہتا لیکن وسطی دور کے طریقے بھی اُسے کم دلچسپ نہ لگتے۔ وہ اُس یُگ میں لوٹ کر کویراج کو سب کچھ اپنے سامنے کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا۔ روگ سے مُکت ہونے کے لیے آدمی کتنا کچھ سہتا ہے۔ اُس یُگ میں علاج کتنا بھی بھیانک کیوں نہ رہا ہو رنگین تصویروں میں اُس کا روپ من کو موہ لیتا ہے۔ جو ہوا سو ہوا اب تو سرجری ہی بھگوان کا وردان ہے۔ اس کا نرادر نہ کیا جائے بلکہ اس کی شرن میں جا کر شراپ کا انت کیا جائے۔ روگ کا مارا انگ آس پاس کے انگوں کو بھی روگی بنا دیتا ہے۔ باپ اس سے بے خبر تھا۔

ڈاکٹر رازدان سے پہلے اُس نے جانے کس کس سے مشورہ کیا۔ سب نے اسے السر کا روگی بتایا۔ لیکن آپریشن نہ سُجھایا۔ بھارت کو یہی بھلا لگا۔ وہ اِدھر اُدھر کی دوائیں کھاتا۔ اُس کا روگ بڑھتا رہا۔ وہ کمزور رہتا گیا۔ پھر بھی اُسے واہمہ کہہ کر رازدان کے پاس جانے سے بچتا رہا ــــــ ایک بھی ڈاکٹر کا خیال ٹھیک نہیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے

السر بھی نہیں۔ یہ ڈاکٹر میرے خاندان سے واقف ہے اور مجھے روگی سمجھتا ہے ٹھیک بات تو ڈاکٹر راز دان ہی بتا سکتا ہے ہر کوئی اُسی سے آخری مشورہ لیتا ہے۔ دوسرے ڈاکٹر جسے السر بتلاتے ہیں وہ کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ اُن کے خیال میں میری آواز نہیں بیٹھی۔ لیکن آواز کا بھاری پن ہی کینسر کی نشانی ہے راز دان یہ نہیں مانتا۔ اُس کا خیال ہے کہ آخری علامت کا جھٹ ظاہر ہو جانا ضروری نہیں۔ پہلے آپریشن ضروری ہے، ورنہ ...

پھر بھی راز دان کے پاس مشورہ کے لیے جانے سے اُسے قباحت ہوتی۔ پہلا اثر دوسرے ڈاکٹروں کا تھا جو اُسے آپریشن کرانے کی رائے نہ دیتے۔ دوسرا اُن مریضوں کا جو راز دان سے آپریشن کرا چکے تھے۔ وہ اُسے آپریشن تھیٹر میں ہونے والے کھیل کا حال بتاتے ـــــ راز دان قصائی کی طرح پیش آتا ہے۔ کمرے میں قرینے سے رکھی صاف شفاف چیزوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جب وہ شیشے کی الماری کے سامنے رُکتا ہے تو اُس کے اندر کا جلاد اُس کی آنکھوں سے جھانکنے لگتا ہے۔ مریض اُسے اور الماری میں پڑے اوزاروں کو دیکھ کر دہشت سے سُن ہو جاتا ہے۔ ایک پتلا سا لمبا نشتر نکال کر جب ڈاکٹر اُس کی دھار کو دیکھتا ہوا مُسکراتا ہے تو روگی خوف سے کانپ اُٹھتا ہے۔ نپے تُلے قدموں سے ڈاکٹر آپریشن ٹیبل کی طرف بڑھتا ہے تو بھیڑیے کا روپ دھار لیتا ہے ...

لوگوں کی بات سُن کر بھارت بوکھلا جاتا۔ میگزین میں چھپی تصویروں میں وسطی دور کے روگ سے چھٹکارا پانے کے کاٹ چھانٹ کرنے والے طریقے اب اُسے خوف زدہ کر دیتے۔ وہ گھوم پھر کر گلے کی گلٹی کو سہلانے لگتا۔ وہ جھنجلا اُٹھتا ـــــ میں بھی عجیب آدمی ہوں کبھی کچھ سوچتا ہوں کبھی کچھ۔ میری یہ سوچ بھی شاید روگ کے کارن ہے۔

وہ سٹ پٹانے لگتا:

آخر راز دان ہی ..... دوسرے روگیوں نے مجھے راز دان کے سفاک ہونے کا بتایا ہے اُس کے پاس جانے سے روکا تو نہیں۔ اُن کے چہروں کا پیلا پن تو آپریشن کی کلپنا کی دین ہے اور اُن کی خاموشی ...

کلینک کی طرف چلا تو بھارت اتنا مایوس نہ تھا۔ قدم قدم پر راز دان میں اُس کا یقین بڑھتا گیا۔ کلینک کے برآمدے کی بھیڑ کا خیال کر کے وہ گھبرانے لگا۔

کلینک میں پہنچتے ہی اُس کی حیرانی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کلینک ویران پڑا تھا۔ وہاں نہ

کوئی مریض تھا نہ ڈاکٹر — نرسوں اور دوسرے کام کرنے والوں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا — شاید آج کلینک بند ہے — وہ سنسان برآمدے میں داخل ہو گیا۔ لیکن مجھے تو آج ہی ... میں انتظار نہیں کر سکتا — وہ بڑبڑایا اور اُس کے قدم کلینک کے پچھواڑے رازداں کی کوٹھی کی طرف اُٹھ گئے۔

کوٹھی بھی سنسان تھی۔ ڈاکٹر لان میں اکیلا بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے خالی میز پڑی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" بھارت نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

"کہو —" ڈاکٹر نے کتاب سے آنکھیں ہٹائے بغیر ہی کہا۔

"شاید آج کلینک بند ہے؟" بھارت کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"تم آپریشن کرانے آئے ہو؟" ڈاکٹر نے کتاب نہیں چھوڑی۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں۔ یہ تو آپ ہی..."

"اگر میں کچھ سمجھ سکتا تو کلینک بند نہ کرتا" ڈاکٹر نے صفحہ پلٹ دیا، "اس میں شک نہیں کہ تمھیں کینسر ہے لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ کچھ بھی تو..."

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہتا ہوں۔ ڈاکٹر کتاب پر نظریں جھکائے ایک ہاتھ سے داڑھی سہلاتا رہا، "روگ نہیں جاتا۔ آپریشن بھی کام نہیں آتا"

"کیوں؟"

"آپریشن ہوتے ہی روگی اپنے سے کٹ جاتا ہے۔ وہ... وہ نہیں رہتا۔"

"اور روگ؟"

"اپنے کو کھو دینا کوئی چھوٹا روگ ہے؟" ٹھنڈی آہ بھر کر ڈاکٹر کتاب میں ڈوب گیا۔

اس بار نہیں

اچھا ہوا اس بار میں شریر سمیت لوٹ آیا۔
جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے اُس کے بیچ بار بار کھڑا ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔
اُوپر بیٹھے رہنے میں بھلائی نہیں لیکن نیچے جانا بھی بے کار ہے۔
بستی کے دائیں سرے کا گھر اٹاری والا ہے باقی سارے گھر اکہرے۔ اٹاری میں میں رہتا ہوں۔ نیچے جانے کے لیے تیرہ سیڑھیاں ہیں لیکن اب تو ایک بھی سیڑھی اُترنے کی ہمت نہیں۔
بائیں جانب سیدھی سپاٹ دیوار پر منڈلاتی پرچھائیں مجھے پھر دکھائی دینے لگی ہمیشہ کی طرح اُس پرچھائیں کے گنجے سر پر ماتھے سے ذرا اُوپر لہراتے بالوں کے گچھے سے بستی بے خبر ہے۔ اپنے درمیان ہر روز چٹیل ہوتے ہوئے میدان کو گھورتی آنکھوں کا بھی بستی کو کوئی علم نہیں۔
کیا بوڑھے کیا جوان، بستی کے مرد بے نیازی سے اُس پرچھائیں کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ اپنے اپنے گھر کے چبوترے پر بیٹھی عورتیں بھی پرچھائیں سے بے خبر اپنا جسم کھجاتی رہتی ہیں۔ پرچھائیں کے وجود سے ناواقف بچے گلی گلی کھیلتے رہتے ہیں۔ کسی کو بھی نہ ہیبت رہی کی چنتا ہے نہ بیتنے والی کی۔
میری بات اور ہے۔ میں ان میں ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ ہوں۔
انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا زہر برسوں اندر ہی اندر اُبلتے رہنے کے بعد

اب ان کے شریر سے رِسنے لگا ہے۔ بوڑھے اور جوان، مردوں کے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی پوریں گلنے لگی ہیں۔ اُن کے ہرے کا رنگ تانبے کا ہو گیا ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں سمٹ گئی ہیں، گال پھول کر بے ڈھب اور مریل ہو گئے ہیں۔

عورتوں کی زبان سے تیزاب ٹپکتا ہے۔ وہ ریزہ ریزہ جھڑ رہی ہیں۔ اُن کے کانوں کی لوریں پکنے لگی ہیں۔ انگ انگ سے مواد بہتا ہے۔

بچّوں کے جسم میں بھی زہر سما گیا ہے۔ پتہ نہیں کب بڑوں کے کرم اُن پر بھاری پڑنے لگیں۔ جو نہیں ہوا وہ بھی ہو جائے گا۔

یہ ڈر صرف مجھے ہے۔

میں آس پاس کو روتے کراہتے سُنتا ہوں۔ مجھے بدبو اور سڑاند کا احساس ہوتا ہے۔ زخموں سے رِستی پیپ بھی مجھے ہی نظر آتی ہے۔

اس کا بھی کارن ہے۔

پوری بستی میں مَیں ہی اٹاری والا ہوں۔ اٹاری کے جھروکے سے ہر روز سوکھتے ویران میدان کو دیکھتا ہوں۔ پچھلے جنم میں بھی میدان کی یہ حالت دیکھ کر ہی مجھے پرچھائیں نظر آئی۔ پرچھائیں کو دیکھتے ہی مَیں متواتر سوچنے کے سنکٹ میں گھِر جاتا ہوں۔

میرے سوا کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ سمے اونگھنے لگا۔ اُجالا سوکھ گیا۔ اندھیرا اٹھما اُٹھا۔

میں ہی دیکھتا ہوں —— جگمگاتی رات کی سیاہی سے لپٹی بستی —— اپنے آپ میں بٹی ہوئی اپنے آپ پر مُسکراتی —— جیسے ناگن نے اپنی پونچھ میں لے رکھی ہو اور اُسے چباتی ہوئی موت کی طرف سرک رہی ہو۔ ہری بھری مُرجھائی بستی جس کا لہو کا ذائقہ چسکے میں بدلتے ہی پرچھائیں میرا دھیان کھینچتی ہے۔

بستی سے الگ ہو کر بھی مجھے پرچھائیں کو پہچاننے میں وقت لگتا ہے۔ شریر دھلوان کرنے والے کو مُنشیہ کی طرح ہی کرم کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ بھی نہ جانتے کی حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے کی گھڑی ابھی کہاں۔ وہ تو انت میں آئے گی۔

ابھی میں بھی دوسروں کی طرح ہر کسی کو پہلے اُس کی کھال سے جاننے کا جتن کرتا ہوں۔ اس کام میں مجھے کھالوں کے سوداگر سے مدد ملتی ہے۔

وہ بے چارہ میرا واقف ہے۔ ساتھی نہیں پر چھائیں کی پہچان میں ضرور میرا ساتھ دیتا ہے۔ اُس جنم میں اُس کا دھندہ زوروں پر تھا۔ شکاری اُس کے پاس کبھی شیر، چیتے، ریچھ، کبھی ہرن، لومڑی اور خرگوش کی کھالیں لاتے اور اچھا پیسہ بناتے۔ جانے اس جنم میں اُسے کیا ہو گیا! اب تو اُس کا دھندہ گدھے کی کھال تک رہ گیا ہے۔ اس کا سبب وہ بھی نہیں جانتا۔ شاید اس بار پرچھائیں بہت گہری ہے۔ بستی کا گھاؤ بھی بتاتا ہے۔ ورنہ میں بھی اتنا بے چین نہ ہوتا۔

اب سوداگر کے ملازم بستی میں جگہ جگہ گھوم کر پتہ لگاتے ہیں کہ گدھا کہاں مرا۔ وہ جھٹ وہاں پہنچ کر گدھے کی کچی دھوڑی گھر لے آتا ہے اور سکھانے کے لیے آنگن میں ڈال دیتا ہے۔ اُس کے گھر والے چیخ چیخ کر اُسے ٹوکتے ہیں۔ پڑوسی کوستے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن اُس کا دھندہ تو جنون بن گیا ہے۔ کئی سال پہلے مرنے والے ایک گدھے کی کھال پہن کر وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

یہ کھال اُسے اس لیے پسند ہے کہ جب گدھے کے مالک نے اُس اڑیل گدھے کو پیٹتے پیٹتے جان سے مار ڈالا، اس وقت اُس پر کتابیں لدی تھیں۔ سوداگر نے گدھے والے سے کتابوں کی بابت پوچھا۔ وہ بولا:

"میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میرے لیے بھی کالا اکشر بھینس برابر ہے۔" سوداگر نے منہ بنایا۔

"میرے وچار میں ان کی جگہ دماغ میں نہیں الماری میں ہے۔" گدھے والے نے اُسے دلاسہ دیا۔ "تم قیمت کی فکر نہ کرو۔"

"پھر بھی ان کا کوئی لابھ تو ہوگا۔"

"کہتے ہیں ان کا گھر میں ہونا شبھ ہوتا ہے۔ میرے لیے تو یہ بے کار بوجھ ہے۔"

سوداگر مسکرایا۔ گدھے کی کھال کے ساتھ کتابیں بھی اُٹھا لایا۔ اگلی صبح اُس نے بڑھئی کو بلا کر شیشے کے دروازوں والی ساگوان کی الماری بنوائی اور اُسے دیوار کے ساتھ ٹکا کر اس میں کتابیں سجا دیں۔ اب وہ ہر آنے جانے والے کو اُنھیں دکھاتا ہے اور جھوم اُٹھتا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ ہنسا اور الماری کی طرف اشارہ کر کے بولا:
"تم لپسنک کی مہما کا بکھان کیا کرتے ہو۔ لو دیکھو..."
"اس وقت میں کتاب کی تعریف کرنے نہیں آیا۔ میں تو مٹی پر پرچھائیں کے چمکتے وجود..."

"اب مجھے کسی دوسرے چمڑے میں کوئی دلچسپی نہیں۔"
وہ مجھے بولنے سے روک کر پاس پڑی گدھے کی کھال پہننے لگا۔
"مجھے بس یہی پسند ہے۔ جانتے ہو کیوں؟" وہ خود ہی جواب دینے لگا۔
"گدھا اَلَدّ جانور ہے۔ اُسے زمانے کے اونچ نیچ سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف اپنی پیٹھ پر لدے بوجھ کا آنند لیتا ہے۔"
میرے چہرے پر پھیلتی حیرانی کو دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا۔ "یہ تم بار بار کس چکر میں پڑ جاتے ہو۔ گدھے کی طرح نربود ھ بنے رہنے میں کیا برائی ہے۔ بدھی ہمیں دستو اور روشیہ کا گیان کراتی ہے۔ دستو اور روشیہ کی کھوج ہی دکھ کا کارن ہے۔ یہ تمھارا اس کھوج میں بار بار اٹاری سے اتر کر نیچے آنا...!"
اس کے چہرے کو جھریوں سے بھرتے دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔

کھالوں کے سوداگر سے نراش ہو کر مجھے پرچھائیں کو اس کی آنکھوں سے پہچانتے کی سوجھی۔ پہلے بھی لوگوں کی کھال کی پرکھ کرنے کے بعد میں ان کی آنکھوں میں سے انھیں پہچانتا رہا ہوں۔
آنکھوں کا ڈاکٹر بھی پاس ہی رہتا ہے۔ وہ میری مدد کرنے سے کبھی نہیں ہچکچایا، لیکن اس بار وہ میری آواز سن کر چونک پڑا۔
"شاید تم نہیں جانتے۔ میں آنکھوں کا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اندھا ہوں۔"
"لیکن چبوترے پر وہ پرچھائیں ——؟"
"اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میری چربی چڑھی آنکھیں کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔"
"پھر بھی...؟"

"تم بھی کیسے آدمی ہو! کیا تم نے سب کچھ جاننے کی ٹھان رکھی ہے؟ آنکھیں رکھنے اور دیکھ سکنے میں بڑا فرق ہے۔ بینائی کو کام میں لا کر ہی اپنے کیے دھرے پر میں پانی نہیں پھیر سکتا۔ بڑی مشکل سے اُس پر سنہری دھول جمی ہے اور روپہلی جالا تنا ہے۔ تم بے کار۔۔۔!"

ڈاکٹر گِلی سڑی اُنگلیوں سے سُوجے ہوئے پپوٹوں کو ملنے لگا تو میں وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے بھی مجھے پرچھائیں کا خیال ستاتا رہا اور میں اُس کی آنکھوں کو دھیان میں لا کر اُن میں اُسے ڈھونڈنے لگا۔ پرچھائیں کی پہچان میرا دھرم ہے۔ لیکن اس بار مجھے اکیلے ہی یہ کام کرنا پڑا۔

پرچھائیں کی آنکھوں میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ تھا۔ ان میں اچھا اور تریاگ کے دائیں بائیں ہوتی انہونی موہ نرموہ کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر میں سُدھ بُدھ کھونے لگا۔ لگاتار بدلتی اڈول جھانکی مجھے پریشان کرنے لگی۔

اندھیرے اُجالے کو ایک مانتے ہی مجھے پرچھائیں پر وشواس ہونے لگا۔ سچ پوچھو تو یہ بستی کی نہیں میری سمسیا ہے۔ بستی اپنے کو بھول جاتی ہے۔ اپنے میں مست ہو جاتی ہے۔ اُسے اپنی چنتا کبھی نہیں ہوتی۔ میدان ہی مجھے پرچھائیں کے منڈلانے کا احساس دلاتا ہے اور میں اُس کی پہچان میں جُٹ جاتا ہوں۔ لیکن میرا شریر میری سمسیا بن جاتا ہے۔ شنکا کا دریا پار کیے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آخری قدم تو مجھے اُٹھانا ہوتا ہے۔ بستی کو اپنی مکتی سے کوئی واسطہ نہیں۔ پرچھائیں کی روپ ریکھا ظاہر ہوتے ہی میں کسی جادو سے کھِنچتا میدان کی طرف چل پڑا۔

بھُورے رنگ کا مٹ میلا میدان۔ جس کی مٹی جمی ہوئی ہے نہ دھول بن کر اُڑ رہی ہے۔ جسے نہ اُوپر کے پانی کا احساس ہے نہ نیچے کے پانی کا۔ جس نے نہ پنچھی کی چھایا دیکھی نہ جس پر ڈھور ڈنگر کے پاؤں پڑے۔ جو انسان کو جانتا ہے نہ دیوتا کو پہچانتا ہے۔

یہ میدان اور یہ بستی ——— بستی اور میں ——— پرچھائیں اور میدان ——— میں اور پرچھائیں ——— کیا تماشہ ہے! جگمگاتے شہر کے جسم پر ناسُور کی طرح پڑا یہ میدان بنجر، ویران اور سُنسان ——— چمکتی آنکھوں والی بے نُور آبادی۔ سیاہی میں ڈوبا اُجلا نگر ——— یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ بھاگ دوڑ؟ سنہری آنکھوں میں ڈولتی ٹھنڈی واسنا؟ ریشمی تن سے آتی نیلنسک آنچ؟ یہ ٹھونٹھ بنتے ہوئے ملائم ہاتھ۔ سڑاند سے

بھرے مخملی گھاؤ۔

دھیرے دھیرے پرچھائیں کی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ اُن میں التجا تیرنے لگی۔ جیسے دیکھتے ہوئے میں کچھ کر گزرنے کی تمنا سے بھرنے لگا۔

مجھے یاد آنے لگا وہ وقت جب اِس میدان کے گرد کوئی دیوار تھی۔ اس کے اندر کی مہک بستی میں پھیلتی رہتی۔ اس کی ہریالی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی۔ اس کے گنبدوں کی آواز امن کا پیغام لاتی۔

اس میں بہتا چشمہ تھکے ہارے مسافروں کی پیاس بجھاتا۔

میری یادداشت کے لوٹتے ہی پرچھائیں کی نگاہوں کی التجا تقاضے میں بدل گئی۔

"اپنا دھرم نبھاؤ۔ مریادا کا پالن کرو۔"

اُسی سمے میری آنکھوں میں بن باس گھوم گیا، زہر کا پیالہ اُبھرا اور صلیب بھی سامنے آگئی۔ میرا گرم لہو اپنے سینے پر گرتا دیکھ کر میدان مسکرانے لگا۔

"نہیں! اس بار نہیں! بار بار نہیں!!!" میں چیخا اور گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سیڑھیاں پھلانگ کر میں اٹاری میں پہنچا اور کواڑ بند کر کے جھروکے کے پاس لیٹ گیا۔

"پچھلے بلیدان کا کیا ہوا۔ حالت تو پہلے سے کہیں زیادہ بگڑ گئی۔ کیا کھالوں کا سوداگر کیا آنکھوں کا ڈاکٹر، دونوں اپنے کو کھو بیٹھے۔ اب تو زہر چمڑے سے رسنے لگا۔ آخر یہ کوڑھ بار بار کیوں پھوٹ نکلتا ہے۔ میں کب تک ۔۔۔؟"

پرچھائیں کی آنکھیں دروازے کو تھپتھپانے لگیں تو میں چلّایا:

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نہیں اس بار نہیں، بار بار نہیں ۔۔۔"

مند اکنی

منداکنی پل کے ادھر کھڑی رہ گئی۔
شوالک اور سانجی پار اُتر گئے۔
انھیں موڑ کاٹتے دیکھ اُن کے پیچھے لپکے بھیرو بابو۔

سات برس کی تھی منداکنی۔
اُسے دھندلے چہرے نہیں بھولے۔
آج وہ اور بھی تیکھے ہو اُٹھے۔

گرمیوں کی جلتی دوپہر۔
ماں کو چارپائی سے اُتار کر فرش پر لٹا دیا گیا۔
سرہانے اناج ڈھیری کر کے اس پر دیا جلا دیا گیا۔

ڈاکٹر نے کینسر کا دوسری بار آپریشن کرتے ہی کہہ دیا تھا:
بی بی! گیتا پڑھا کر!

دیکھتے ہی دیکھتے سگے سمبندھی آنے لگے۔

اڑوس پڑوس اکٹھا ہونے لگا۔
گلی کا کتا رونے لگا۔
مرد آنگن میں، عورتیں کمرے میں بیٹھنے لگیں۔

مندا کنی کمرے کے کونے میں بیٹھی واتا ورن کو پل پل بوجھل ہوتے ہوئے دیکھنے لگی۔ لٹکے چہرے، اُداس آنکھیں، خاموش ہونٹ، جھکی گردنیں۔
معصوم لڑکی کی سمجھ میں زیادہ نہیں آیا۔ اتنا جان گئی کہ کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔ اپنے ننھے وجود میں پھیلتے خوف سے نپٹنے کے لیے اس نے پاس بیٹھے اپنے سے چھوٹے کانتی کو پہلو میں سمیٹ لیا۔ خیال اس کا کانتی سے چھوٹے نندو کی طرف بھی گیا جو آنگن میں بیٹھے دادا کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔

چتا کو آگ دکھاتے ہی باپ کی آنکھوں میں ہاری ہوئی آشا کا لہو لہرا اٹھا۔ اونچی اٹھتی لپٹوں کو ایک ٹک دیکھتا ہوا وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
بنسی! گھر چلو۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ مٹی تو کب کی رتی...
محلے کی سیانی ایسری تائی نے مندا کنی کے باپ کو بازو سے پکڑ کر پکارا۔ وہ بیٹی کو ساتھ لیے روتے من سے گھر کو چل پڑا۔

بھاگو چاچی نے مندا کنی اور اس کے بھائیوں کو آخری سانس لیتی ماں کے پاس بٹھا دیا تھا۔ مرنے والی کے چہرے پر عجیب مایوسی اور لاچاری ابھر آئی۔ وہ سامنے بیٹھے چہروں پر نظریں گھمانے لگی۔ انت میں اپنے مرد اور بیٹوں کو نہارنا چھوڑ کر اس نے لاچار نگاہیں بیٹی پر جما دیں اور پران تیاگ دیئے۔
اس لاچاری میں حکم بھی تھا التجا بھی۔
مندا کنی کو بات سمجھ میں آئی یا نہیں وہ اُن نگاہوں کو زندگی بھر نہیں بھولی۔ انہیں یاد کر کے ہی...

ماں کی آنکھوں میں تیرتی گیلی آشا ماں تک رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ بات تو...

مندا کنی کو یاد ہے:
دادا دادی چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ مندا کنی کی ماں زندہ تھی تو کبھی کبھار آتے۔ پوتی پوتوں سے لاڈ جتاتے۔ بہو بیٹے کو کھری کھوٹی سناتے۔ بیٹا ان کی بات ہنس کر ٹال دیتا۔ بہو انھیں چائے پانی پروس کر۔

بہو کے مرتے ہی وہ روز آنے لگے۔
بیٹے کو سمجھانے لگے:
رواداری کرنا آدمی کا کرم۔ گئی بیتی کے پیچھے مرنا پاپ اور ادھرم۔
رونا دھونا چھوڑ — کام کاج کا دھیان کر اپنا اور اولاد کا کلیان کر۔
ایک دن دادا دھیمے لہجے میں بولے۔
جیون نانی کئی بار آیا۔ لڑکی خاندانی ہے، گھر بڑا نہیں۔ میں نے حامی نہیں بھری۔ لیکن کب تک۔ آج نہیں تو کل...
دادی نے دادا کی بات بیچ میں کاٹ دی۔
لوگ ارتھی اٹھنے سے پہلے گھر میں دوسری ڈولی لے آتے ہیں۔ عورت کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے۔ پاؤں کی جوتی! پھٹ جائے تو دوسری لے آؤ۔ دیر کتنی لگتی ہے مگر تو نادان کی طرح...

وہ بیٹے کو کڑی نظر سے دیکھنے لگی۔
تو مجھے چابی دے۔ دیکھوں بہو کیا کچھ چھوڑ گئی۔ آنے والی کے لیے بھی کچھ...
اس دن سے دادی بنسی کے یہاں رہنے لگی۔
بنسی — دھرم کرم کو ماننے والا۔ پوجا پاٹھ کا رسیا۔ بیوی زندہ تھی تو سانجھ سویرے مندر جاتا۔ بیوی کے چلے جانے کے بعد وہ مندر اور پوتھی کا ہو کر رہ گیا۔
منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا۔ مندر کا چبوترا اور سیڑھیاں دھوتے ہوتے ہری گن گاتا۔ پجاری آرتی اتارتا وہ کھڑتال بجاتا۔ دیوتا کو بھوگ لگاتا۔ لوگوں کو ست کرم کا مارگ سمجھاتا۔ واپسی

پر راستے میں رام نام کی رٹ لگاتا۔

باپ کو گیان دھیان میں ڈوبا دیکھ کر مندا کنی کا وشواس لوٹ آتا —— ماں نہیں مر سکتی ——

بھولی مندا کنی نہیں جانتی تھی:

ماں باپ کی بات پر جھلانے والا۔ دوسروں کے سمجھاؤ کو ٹھکرانے والا مرنے والی کے ساتھ اپنے لگاؤ کی بات بار بار دہرانے والا بنسی ایک دن مسکرانے لگا۔ دل پر کھنچی لکیر مٹانے لگا۔ بیٹی بیٹوں سے شرمانے لگا۔ ان کی ماں کی تصویر کے آگے پھول رکھنے سے کترانے لگا۔ کسی دوسری مورت سے من کو رجھانے لگا۔

ماں کے فوٹو پر جمی دھول صاف کرتی مندا کنی کبھی بھائیوں کو دیکھتی کبھی باپ کو، تھک ہار کر اپنے آپ کو۔

ایک دن صبح سویرے سگے سمبندھی اور اڑوس پڑوس پھر آنگن میں اکٹھا ہونے لگا۔ سجا سنورا، رنگ برنگ کپڑوں میں۔ چہروں پر مسرت۔ شادی ذرا دھوم اور دھمک کم کم —— دوسری شادی پہلی جیسی نہیں ہوتی ——

باپ کو نئی پوشاک میں دیکھ کر نند و مچل اٹھا۔ وہ اس کی گود میں جانے کے لیے ضد کرنے لگا۔ بنسی نے بہت پچکارا۔ بیٹا نہ مانا۔ تھک ہار کر بنسی اپنے کو کھو بیٹھا۔ اس نے نادان پر ہاتھ اٹھایا اُسے اپنا اصلی چہرہ دکھایا۔ گھڑکی دے کر ڈرایا۔ بچہ دادی کی گود میں دبک گیا۔ معصوم وجود سُبک گیا۔

مندا کنی کو یاد ہے:

کانتی اس کے ساتھ کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لوگ لاری میں بیٹھنے لگے تو اس سے رہا نہ گیا۔ باپ کو آواز دیتا ہوا بس کی طرف بھاگا۔ مندا کنی اس کے پیچھے لپکی۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اپنے پر بھی قابو ڈالا

بس چل پڑی۔

بھائی بہن دھول میں اٹے کھڑے رہ گئے۔ کانتی نے بازو پھیلائے، مندا کنی اُسا پنے

سے چلپائے۔

باپ کی شادی میں بچے نہیں جاتے ــــ بچوں کو کون سمجھائے

نئی ماں کا نام تھا رُکمنی۔

اپاہج ماں اور نادار باپ کی ساتویں اولاد بنسی سے عمر میں کہیں چھوٹی۔ بنسی پہلی شادی ذرا پہلے کرتا تو رُکمنی اس کی پہلوٹھی کی بیٹی ہوتی۔

رُکمنی میں ایک ہی گن تھا۔ بھرے گٹھے سڈول شریر پر چھائی سدا بہار مسکان۔ بھولی بھالی ناداں۔ وہ آئی۔ نہ بنسی کو دیکھ کر لجائی نہ ساس کو دیکھ کر شرمائی نہ منداکنی کانتی اور نندو کو دیکھ کر گھبرائی۔ وہ تو گھر میں آتے ہی مُسکت من سے باتیں کرتی ہوئی ہر کسی کو پتہ نہیں کیا سمجھانے لگی۔ بارہ کمروں کی حویلی میں الہڑ قدموں سے گھومتی ہوئی اپنا راز بتانے لگی۔

نئی دلہن کی مسکان۔ محلے کے لیے وردان۔ پاس پڑوس حویلی میں گھس آیا۔

آج موہن دئی آئی تو کل سوہن دئی۔ جو آئے سیوا کرائے کچھ نہ کچھ ساتھ بھی لے جائے۔

ساس بولتی رہی۔ بہو بھنڈار کا منہ کھولتی رہی۔

بنسی کو دو کام ــــ دن بھر دکان رات کو رُکمنی کا نام جھام۔

وہ ماں کی مانتا نہ اولاد کو پہچانتا۔

نئی بیوی نے پتہ نہیں اسے کیا پڑھا دیا۔ اپنے جوبن کا نشہ پلا دیا۔

وید شاستر، دیوی دیوتا تک کو بھلا دیا۔

رُکمنی من کی بُری نہ تھی۔ اس کے اندر نفرت تھی نہ بیر۔ وہ ساس کو ستاتی نہ سوتیلی اولاد کو رُلاتی۔ کام کاج سے بھی جی نہ چراتی۔ رسوئی بنانے سے لے کر برتن مانجھنے تک سے نہ کتراتی۔ سب کو کھلانے کے بعد کھاتی لیکن گھر لٹانے سے باز نہ آتی۔ پتہ نہیں کیوں اسے لگتا ــــ گھر بار سب بے کار ــــ اسے سامنے پڑی چیز کو دیکھ کر دھن سما جاتی ــــ کاش کوئی آئے اور مجھ... اسے لے جائے۔

مند اکنی نہیں بھولی :

شام کا وقت تھا۔ رُکمنی تیسری منزل سے نیچے اُتری۔ آنگن میں آکر اس نے نل پر ہاتھ میں پکڑی بالٹی دھوئی۔ اور ڈیوڑھی میں بندھی بھینس دوہنے لگی۔

آدھا دودھ نکالا تھا کہ سامنے والے مکان کی پُورنا موسی لوٹا لیے آدھمکی۔ پُورنا کو دیکھتے ہی رُکمنی کھل اٹھی۔ بالٹی کے بجائے وہ لوٹے میں دودھ دوہنے لگی۔ دوسرے ہی پل وہ بھونچکی رہ گئی۔ ڈیوڑھی کے دالان میں کھڑی تھی اس کی ساس —— یہ کہاں سے آ ٹپکی یہ تو ابھی اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر گئی تھی —— رُکمنی کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ کر بالٹی میں گر گیا۔ بالٹی کا تھوڑا دودھ چھلک کر فرش پر بکھر گیا۔ پھر کیا تھا۔ ساس اُبل پڑی۔ بہو کو جی بھر کر سنانے کے ساتھ اسے کنگال کی اولاد کہہ ڈالا انت میں ایشور کی دہائی دیتے ہوئے شراپ دے ڈالا

کم ذات! لوگ دُودھ پُوت سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ تو ان کی ناقدری کرتی ہے۔ سوتیلوں کا نہیں تو اپنی کوکھ سے جنوں کا ہی دھیان کر۔ تو جو آج ہر چیز کا نرادر کرتی ہے کل دانے دانے کو ترستی پھرے...

دادی کا شراپ حویلی میں گونج اٹھا۔

مند اکنی کانپ گئی۔ اسے لگا دادی نہیں بولی آنے والے دن بول اُٹھے۔

اس رات نئی ماں سسکتی رہی۔ باپ دہاڑتا رہا۔ دادی ہاہا کار کرتی رہی۔

اس رات مند اکنی نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔ دونوں اپنے اور تینوں سوتیلے بھائیوں کو من میں بٹھا کر اس نے عہد کیا کہ وہ ایک پل کو بھی کتاب پر سے نظر نہ ہٹائے گی۔

دادی کا شراپ رنگ لا کر رہا۔

کہتے ہیں چوبیس گھنٹوں میں ایک پل ایسا آتا ہے جب کسی کی زبان سے نکلی بات سچ ثابت ہو کر رہتی ہے۔ وہ بات کوئی اور نہیں سرسوتی کہتی ہے۔

چند برسوں میں گھر بھنڈار خالی ہو گیا۔ بمبئی کا کاروبار سوالی ہو گیا۔ وہ جو مال خریدتا مندا ہو جاتا۔ جو چیز بیچتا تیز ہونے لگتی۔ پوری منڈی خریدنے والا چھوٹے چھوٹے سودے کرنے سے گھبرانے لگا۔ دکھ میں سمے بتانے لگا۔ زمین جائداد گھاٹے کی نذر ہونے لگی۔ بچا کھچا بوی بچوں کے پیٹ میں سمانے لگا۔

بنسی کی ماں سے بربادی نہ دیکھی گئی۔ اس کے آدمی نے بڑے جتن سے پیدا کی تھی زمین جائداد۔ وہ اسے جاتا دیکھ کر سہہ نہ سکی۔ ایک بار بستر پکڑا تو اُٹھ کر نہ دیکھا۔ روتی پیٹتی چل بسی۔ بہو کی رگ نہ بدلی۔ ساس نے آنکھ بند کی تو وہ کھل کھیلی۔ لٹتے لٹاتے وہ وقت آ گیا جب کمروں میں تالا ڈالنے کی ضرورت رہی نہ رات کو ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے کی۔ گھر میں پڑے چھوٹے بڑے ٹرنک کنگال کے پیٹ کی طرح بجنے لگے۔

مندا کنی حیران تھی۔ نہ نئی ماں بات کو خود سمجھتی نہ باپ اسے سمجھاتا۔ دونوں وہی کرتے جو ان کے جی میں آتا۔

سب کچھ لٹا کر بنسی پوجا پاٹھ کی طرف لوٹا۔ سب کچھ لٹانے کے بعد بھی اس نے بیوی کا پنڈ نہیں چھوڑا۔

مندا کنی نے ایم۔اے پاس کیا تو اس کا نیا بھائی پیدا ہوا۔ بنسی کا بارہواں بچہ اور رکمنی کا نواں۔

اس دن مندا کنی لرز گئی۔ ساس کے جی میں آئی چیخ اُٹھے لیکن اس نے آواز نہیں نکالی۔ باپ کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی آشا کا لہو اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ ساتھ ہی اُبھری آخری سانس لیتی ماں کی آنکھوں میں اُمڈتی لاچار التجا۔ اس کے علاوہ دماغ پر جال کی طرح تن گیا نئی ماں کا معصوم اور بے لوث پیار۔

کالج سے نکلتے ہی مندا کنی کو نوکری نہ مل جاتی تو پتہ نہیں بنسی اور رکمنی کو کیا کچھ کرنا پڑتا۔

مندا کنی نوکری کرتی رہی۔ باپ کی اولاد کے لیے مرتی رہی۔

کانتی کالج میں جاتے ہی بگڑ گیا۔ اسے جوئے اور شراب کی لت پڑ گئی۔ وہ ماں باپ کا سامنا کرنے لگا۔ اپنی موت آپ مرنے لگا۔ مندا کنی کو ٹوک اُٹھتی لیکن کہہ کچھ نہ سکتی۔ کانتی کو دیکھتے ہی اسے اپنی ماں کی نگاہیں یاد آ جاتیں۔ اُن میں تیرتا کرب اس کے منہ پر تالا ڈال دیتا۔ کانتی بھی بہن کے آگے آنکھ اونچی نہ کرتا لیکن اور کسی سے نہ ڈرتا۔

مندو شریف تھا لیکن دماغ کا غریب تھا۔ مندا کنی چاہتی تھی پڑھ لکھ کر وہ بڑا آدمی بنے۔ ماں کی آتما کو کچھ تو شانتی ملے۔ بیٹی بنا شادی کیے گیارہ بچوں کی ماں بن گئی۔ بڑا بیٹا کسی کام کا نہ نکلا۔ چھوٹا ہی کچھ کر دکھائے... مندا کنی کو لگتا ___ ماں رونے لگی۔

اپنے بھائیوں سے ناراض ہو کر وہ رُکمنی کے بچوں کی طرف جھکی۔ وہ بیگانے نہ تھے۔ رُکمنی نے سوتیلے پن کا احساس پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ مندا کنی کو ایسا کوئی دن یاد نہیں جب نئی ماں نے ان تینوں کو اپنی کوکھ سے جنے ہوؤں سے بڑھ کر نہ مانا ہو۔

رُکمنی کے بچے اصیل تھے لائق نہیں۔ اُن میں چستی نہ تھی۔ بات کو دیر سے سمجھتے۔ دھیمی چال چلتے۔ ایک دن کا فاصلہ ہفتے میں طے کرتے۔

سمے بیتتا گیا۔ اس کے ساتھ بیت، چلی مندا کنی۔

باپ پوتھی کا ہو کر رہ گیا، رُکمنی گھر بار کی۔

بہن بھائی اپنے ٹھکانے لگتے گئے۔ مندا کنی سے کٹتے گئے۔ آپس میں بٹتے گئے۔ وہ دیدی کو نمسکار کرنے اور اس کا آشیرواد لینے آنا تک بھول جاتے۔ کئی بار بُلانے پر ایک بار آتے۔ دیدی کی نہ سُنتے بس اپنی سناتے۔

ایک رات بنسی کی چھاتی میں درد اٹھا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ بھگوان کو پیارا ہو گیا۔

مندا کنی نے دیکھا اس کی ماں کی طرح باپ نے بھی رکمنی کو نہارنا چھوڑ کر نگاہیں اس پر گاڑ دیں ___ وہی لاچار التجا ___

لیکن رُکمنی پتی کا وچھوڑہ نہ سہہ سکی۔ اسے تقدیر سے گلہ بے شک رہا ہو اپنے آدمی سے شکایت نہ تھی۔ بنسی نے اچھے بُرے کسی وقت اس کا ہاتھ نہ روکا تھا۔ اسے کسی بات پر نہ ٹوکا تھا۔ وہ بھی جلدی بنسی کے پیچھے چل دی۔

نئی ماں مری تو مندا کنی چالیس پار کر چکی تھی۔

پتہ نہیں کتنا زندہ تھی کتنا مر چکی تھی۔
ایک پیڑ جو موسم کو اوڑھ سکتا تھا نہ چھوڑ سکتا تھا۔

بنسی اور رکمنی کا نواں بچہ منداکنی کو بتائے بغیر بدیس چلا گیا تو اسے لگا جس ڈور سے بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ شاید وہ بندھن سے بے وقت چھوٹ گئی ___ گائے جیسے کھونٹے کے بغیر زندگی بے کار نظر آئے۔
منداکنی بسنت کے انتم دنوں کی طرح اُداس رہنے لگی۔
پہلے وہ کبھی کبھار سوچتی:
اپنوں سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوتا!
اب وہ اکثر کراہ اُٹھتی۔

انہی دنوں منداکنی کے دفتر میں آیا شوالک۔ اس کا نیا اسٹینو۔
شوالک ___ پیارا نوجوان۔ فرمانبردار، خوش اطوار، یاروں کا یار۔
منداکنی کے سامنے بیٹھتا تو اسے لگتا وہ اس کے اشارے کا منتظر ہے۔
وہ پہلے پہل گھبرائی لیکن جلد ہی لوٹ آئی ___ بہار کے آنے کا کوئی وقت نہیں ___

اکثر وہ شوالک کو خط لکھواتے ہوئے الجھ جاتی۔ اپنے کو اپنے سے باہر پاتی۔ اندر ہی اندر کسمساتی۔
وہ دیر تک دفتر میں بیٹھنے لگی۔ شوالک کو اپنے گھر تک موٹر میں لے جانے لگی۔ راستے میں ریستوراں میں بیٹھ کر جی بہلانے لگی۔ اپنے کو کھونے شوالک کو پانے لگی۔
ایک دن شوالک اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیواروں پر سجے چتر دیکھ رہا تھا۔ ایک چتر پہ وہ رک گیا اس میں صرف ایک پیڑ تھا جس پر لٹکتا ایک پھل۔

پتے آپ کھو چکے تھے جیسے اپنے کو رد چکے تھے۔

مندا کنی شوالک کے چہرے کو پڑھنے لگی :

کہاں کھو گئے ؟

شوالک نے پیڑ پر سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

میں اس کے کرب کو محسوس کر رہا ہوں۔ یہ سمجھتا ہے اس کا وجود بے کار ہو گیا۔ یہ نہیں جانتا جاتی ہوئی رُت کے آخری پھل کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے...

اس رات مندا کنی نہیں سوئی۔ من ہی من ڈولتی رہی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے کو تولتی رہی۔ اسے لگا اس کا انگ انگ اس سے اپنے کو وصول کرنے پر تل گیا۔ اس کے وجود کا دُوار کھل گیا۔ مہمان کے سواگت کے لیے راستہ دُھل گیا۔

وہ دن آگیا جب مندا کنی کنوارپن کے رس کی بچی کھچی بوندیں دیوتا کی بھینٹ کرنے شوالک کو ساتھ لے کر بھوالی کے لیے چل پڑی۔

سارا راستہ دونوں خاموش رہے۔

انتظار کے نشے میں مدہوش رہے۔

دوپہر کو بس بھوالی جا پہنچی۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی شوالک کو سکیٹنگ کا بھوت سوار ہو گیا۔

مندا کنی نے اسے نہیں روکا۔ اسے تو رات کا انتظار تھا۔

شوالک شام تک سکیٹنگ کرتا رہا۔ مندا کنی ہوٹل میں بیٹھی اپنے کو جانچتی رہی۔ کپڑوں اور میک اَپ کو آنکتی رہی، جذبات کی سچائی، احساس کی گہرائی کو ناپتی ہوئی وہ اپنی نس نس کو پکارتے سننے لگی۔ عجیب سپنا بننے لگی۔

شام کی چائے انھوں نے بالکنی میں بیٹھ کر پی۔ شوالک خوش تھا۔ مندا کنی مسرور۔ آپس میں بات نہ کرتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو پا رہے تھے۔ آنے والے لمحوں

سے آنکھ بچا رہے تھے۔

رات پڑ گئی۔
منداکنی اور شوالک ڈنر کے لیے ہوٹل کے ہال میں آ گئے۔
ہال جگمگا رہا تھا اپنے جوبن پر اترا رہا تھا گیت گا رہا تھا۔ واتاورن کو بھر رہا تھا۔ میز کے گرد بیٹھے تھے منداکنی اور شوالک کے علاوہ ادھیڑ بھیرو بابو اور جوان سانجی۔۔

شوہر اور بیوی ـــــ
ڈنر آتے آتے چاروں آپس میں گھل گئے۔
ڈنر ختم ہوتے ہی سیر کے لیے نکل پڑے۔

سڑک پر سردی زیادہ تھی۔
بھیرو بابو کے پاس تھا سانجی کا کوٹ اور شال۔
سانجی کو اپنے بازو اپنے ہی شریر کے گرد کستے دیکھ کر شوالک مسکرایا۔
دوسرے ہی پل اس نے بھیرو بابو سے شال پکڑ کر سانجی کو اوڑھا دی۔
سانجی کی کنچن کایا اندر تک مسکرا دی۔
پہاڑ، جنگل اور ندی گنگنا دی۔

تھوڑا فاصلہ طے کرتے ہی شوالک اور سانجی آس پاس کو بھول گئے۔
وہ باتیں کرتے ہوئے آگے آگے چلنے لگے۔
منداکنی اور بھیرو بابو پیچھے رہ گئے۔

بھیرو بابو کو لگاتار بولتے دیکھ منداکنی گھبرائی پر کچھ سوچ کر وہ من ہی من بلبلائی پھر دور تک ہو کر لوٹ آئی۔
سانجی اور بھیرو بابو؟ ـــــ شوالک اور منداکنی؟ ـــــ وہ مسکرائی بھیرو بابو کو دھیان سے دیکھتی ہوئی ان پر گر آئی۔

پُل آگیا۔

شوالک اور سانجی اپنے میں ڈوبے پار اُتر گئے۔

مندا کنی پُل کے اِدھر رُک گئی۔ بھیرو بابو بھی ٹھٹک گئے۔ لیکن اُسی پل موسم بدلنے لگا۔ آکاش بادلوں میں چھپ گیا۔ اس میں جھلملاتا ستاروں کا جھرمٹ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلے ہی پل مندا کنی نے دیکھا بھیرو بابو آنکھیں پھاڑے شوالک اور سانجی کو موڑ کاٹتے دیکھنے لگے۔

وہ ہکلائے:

ہوا چل پڑی۔ سردی بڑھ گئی۔ سانجی کا کوٹ...!

انھوں نے بازو پر لٹکتا کوٹ کندھے پر ڈال لیا:

کہیں سانجی کو سردی نہ...

سب کچھ بھول کر بھیرو بابو شوالک اور سانجی کے پیچھے لپک چلے۔

لہو کی بُو

"تم مانتے کیوں نہیں ؟"

اُس نے سامنے بیٹھے دوست کی طرف دیکھا اور کھُل کر سانس لینے کی کوشش کرنے لگا :

"پہاڑ کے اُس پار سے آنے والے اکا دکا جھونکوں میں لہو کی بُو ہی نہیں آگ کی بھبھک اور آنچ بھی ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے اگر وہاں خون بہہ رہا ہو اور آگ لگ گئی ہو۔" دوست پریشان ہو اٹھا۔

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوا کا تار ادھر کی چلے تو پتہ لگے۔ شاید مجھے باہر پھیلا سناٹا ڈرا رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے قدرت کسی پرانے المیے کو یاد کر کے آہیں بھر رہی ہو۔ کوئی بات ضرور ہے ورنہ میں ...."

"مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ شاید وہم میں پڑنا میری عادت نہیں۔" دوست اُس سے دور جانے لگا۔

"تم دیر تک پہاڑ کے اُس پار نہیں گئے۔ کوئی اپنی بستی کی سرحد دوسروں پر یونہی بند نہیں کر دیتا۔ بات کو چھپانے کے پیچھے کوئی راز ہوتا ہے۔"

"دوسروں کے بارے میں ہر وقت سوچتے رہنا ٹھیک نہیں۔ اُن کے بارے میں اندازے لگاتے رہنے سے ہمارا اسن بیمار ہو جاتا ہے۔ سوچ دھندلی پڑ جاتی ہے۔ ہمارے اندر وسوسوں کا جال پھیل جاتا ہے۔ ہم اُس میں مکھی کی طرح پھنس جاتے ہیں۔ تم اُس پار کا خیال چھوڑ دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کل تک جو اپنا تھا آج بیگانہ ہو گیا۔ چوٹیاں، ڈھلانیں، وادیاں! اپنے سے تعلق توڑ لینا آسان بات نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ فاصلے جیسی عجیب شے دوسری نہیں۔ دُور ہوتے ہی ہمارا دیکھا بھالا، جانا پہچانا بھی غیر معمولی لگنے لگتا ہے۔ ہم اُس کے لیے ترس اُٹھتے ہیں۔ یہ سب فاصلے ہی کی دین ہے۔ بیتی ہوئی کڑوی اور بے سواد زندگی بھی میٹھی لگنے لگتی ہے۔" دوست اُس کے ساتھ ہو لیا، "کھڑکی کھول کر دیکھو کوئی باہر کھڑا ہمیں پکار رہا ہے۔"

"ایسا نہ کہنا"، وہ سہم گیا "کھڑکی کھلتے ہی دہشت بھری دھند اندر گھس آئے گی۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔ وہی درندے کی طرح ہمارے گرد گھل پر تھوتھنی رگڑ رہی ہے۔"

"درندہ کہاں سے آ گیا؟"

"دھند کوہستان سے اُٹھتی ہے۔ کوہستان میں پھیلی برف مجھے ہمیشہ درندہ بن کر ڈراتی ہے۔" دوست کو مسکراتے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

"مجھے پتہ ہے دھند اپنے اندر کیا کچھ چھپائے ہوتے ہے۔ قدرت کا سہم جانا معمولی بات نہیں۔ مجھے لگتا ہے اُس پار کی فضا ہماری بستی پر منڈلانے لگی، اسی لیے میں شام ہوتے ہی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتا ہوں۔ لوگ بھی رات گئے تک باہر نہیں ٹھہرتے۔ تم ہی کہو موت کا چہرہ دیکھنا کسے پسند ہے؟"

"میرے خیال میں یہ سب جاڑے کے کارن ہے۔ موسم کی سختی ہماری سوچ کو منجمد کر دیتی ہے۔ کیا تمھیں یقین ہے ہواؤں میں بسی بُو انسانی خون ہی کی تھی؟"

"فضا میں تیرتی چیخ یہی بتاتی ہے"، اُس نے لمبا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب بتی بجھا دو۔ صبح ہوتے ہی سب معلوم ہو جائے گا۔"

"میں بتی نہیں بجھاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے"، وہ گھبرا اُٹھا "میں نہیں مانتا کہ صبح ہوتے ہی ہمیں سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کیسی بات کرتے ہو؟"

"میں غلط نہیں کہتا۔ صبح کا منہ دیکھنا آسان بات نہیں۔ صبح کے انتظار میں..." وہ تڑپ اُٹھا، "تم نہیں جانتے۔ تم بھی نہیں جانتے۔"

"میں کیا نہیں جانتا؟"

"یہی کہ اُجالا اپنے میں ایک پردہ ہے،" وہ اپنے چہرے کو میز کے درمیان تک لے آیا، "سورج کی روشنی اور تپش بُو کو ختم کر دیتی ہیں۔ آگ کی آنچ کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ صبح کا شور سب کچھ جذب کر لیتا ہے۔ اِس میں نہ سسکی سنائی دیتی ہے نہ ہُوک۔" اُس کی آواز بھی گمبھیر ہو گئی، "اُجالا پھیلنے اور صبح ہونے میں بڑا فرق ہے۔"

"مجھے بتاؤ کیا ساری بستی میں ہم ہی جاگ رہے ہیں؟" دوست اندر تک ہل گیا۔

"ایشور کرے ایسا نہ ہو!" وہ پریشان ہو اُٹھا، "شکر کرو ہوا پر کسی کا زور نہیں۔ ہوا نہ چلے تو مرنے والوں کی چیخ تک سنائی نہ دے۔ ہوا قدرت کا سفیر ہے۔"

اُس کی بات سن کر دوست نے لمبی سانس بھری اور پگھلتی ہوئی موم بتی کو گھورنے لگا۔ باہر ویران سڑک سنسان ڈگر پہ چلتی رہی۔ موڑ کاٹتی رہی۔

اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی دونوں گھر سے نکل پڑے۔ سڑک پر تھوڑی دُور چلنے کے بعد انھیں خاکروب دکھائی دیئے۔ خاکروب چوک میں جلتے الاؤ کے گرد بیٹھے اندر تک گھُس آئی سردی کو باہر نکالنے میں لگے تھے۔ انھیں بے کار بیٹھے دیکھ وہ غصے میں آ گیا:

"کوڑا کون اُٹھائے گا؟ شہر سنڈاس بن گیا۔ سانس لینا مشکل ہو گیا۔"

"بابو! سردی تو دیکھو۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے۔ بدن کاٹھ بن گیا۔ جھاڑو نہیں پکڑی جاتی بٹ" خاکروب الاؤ میں لکڑی ڈالنے لگا۔

"تم تو ان سے اُلجھ پڑے۔ یہی لوگ ہیں جو ہماری بات کا جواب دے سکتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی یہ رات جاگ کر کاٹتے ہیں۔ ان سے مطلب کی بات پوچھو۔ خواہ مخواہ..." دوست اُسے سمجھانے لگا۔

"کیا تم رات بھر جاگتے رہے؟" اُس نے اپنی جھلاہٹ کو دبایا۔

"ایک آدھ جھپکی کا کہہ نہیں سکتے۔ اِس کڑاکے کی سردی میں مر پر چھت کے بغیر کون سو سکتا ہے؟ ہمارے پاس نہ بستر ہے نہ چارپائی؟" بوڑھے نے اُس کی طرف اُداس نظروں سے

دیکھا۔" تم یہ سب کیوں پوچھتے ہو؟"

"رات ہوا میں بسی اِنسانی خون کی بُو سونگھی تھی؟" اُس نے بوڑھے کی بات اَن سُنی کر دی۔

بوڑھا اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"آگ کی بھبھک بھی محسوس نہیں کی؟"

بابو! کیسی بات کرتے ہو؟ ہمیں نہ بُو کا احساس ہوتا ہے نہ تپش کا،" بوڑھا خاکروب جھے ہوئے آس پاس کو دیکھنے لگا۔

آگے سڑک خالی تھی۔ آوارہ کُتا تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

وہ دوست کی طرف دیکھنے لگا۔

"کریانی کے پاس چلتے ہیں۔"

"کریانی!" وہ چونکا" چترکار! اُسے کیا معلوم ہوا کیا کہتی ہے۔ فضا کیا بتاتی ہے"

"اُسے نہیں تو اور کسے معلوم ہو گا؟" دوست دُور تک دیکھنے لگا،" رنگ روپ کا جانکار!"

کریانی سٹوڈیو میں ایزل پر ٹکی ادھوری تصویر کے سامنے کھڑا اُسے دھیان سے دیکھ رہا تھا دروازے کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔

دوست نے اُسے بہت روکا لیکن وہ کریانی کے لوٹنے کا انتظار نہ کر سکا:

"چترکار! کیا تم نے رات ہوا میں بسی خون کی بُو سونگھی؟"

"ہوں؟" کریانی نے تصویر پر سے آنکھیں ہٹائے بغیر ہُنکار بھری۔

"تم نے فضا میں تیرتی چیخ بھی سُنی ہو گی؟"

"کیا کہا؟" بوڑھا اُن کی طرف پلٹا،" کیسی بُو؟ کس کی چیخ؟"

"اِنسانی لہو کی بُو۔ اِنسان کی چیخ۔"

"کیا بکتے ہو؟" چترکار لپکا اور اُسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ تھوڑی دیر تک اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد وہ ادھورے چتر کی طرف اشارہ کرنے لگا:

"بکھراؤ ہی بکھراؤ۔ گڈ مڈ۔ انتشار۔ ایک بھی شکل دوسری سے جڑی ہوئی نہیں۔ رنگ آپس میں میل نہیں کھاتے۔ صبح شام کا بھید مٹ گیا۔ نہ بھور کا اُجالا رہا نہ سانجھ کا دُھندلکا۔ نہ ریکھا — نہ رنگ — نہ روپ..."

"تم نہیں جانتے۔ تم نہیں سمجھتے۔ یہ پھیلتی ہوئی سسکی، گونجتی ہوئی ہُوک، خون یونہی نہیں بہتا۔ انسان یونہی نہیں چیختا۔ کہیں اتہاس تو کروٹ نہیں بدلنے لگا؟ انسانی خون! انسانی چیخ!

"تم پہاڑ پر چلے جاؤ۔ ابھی روانہ ہو جاؤ۔ چوٹی پر پہنچے بغیر دم نہ لینا۔ اُدھر کی ڈھلان اپنی کہانی سنائے گی۔"

کرمانی نے برش اُٹھالیا۔ وہ پلیٹ میں رنگ ڈال کر انھیں ملانے لگا۔ ادھورے چتر کو وچتر نظروں سے دیکھنے لگا۔

کرمانی کے سٹوڈیو سے نکلے تو وہ پریشان تھے۔

وہ بار بار پہاڑ کی چوٹی کو دیکھتے۔ چوٹی بہت اونچی تھی۔ اُس پر چڑھنا جوکھم کا کام تھا۔

"چوٹی پر پہنچے بغیر کچھ دکھائی نہیں دے سکتا۔ نہ خون کے کارن کا پتہ چل سکتا ہے نہ چیخ کی وجہ معلوم ہو سکتی ہے۔" کمرے میں لوٹتے ہی وہ کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ "لیکن چوٹی پر پہنچنا آسان بات نہیں۔"

"چوٹی پر پہنچے بغیر ہم اندازہ لگائیں گے۔ اندازے پر ہمیں ہی یقین نہ آئے گا۔" دوست نے حوصلہ نہ ہارا۔ "چلیں گے تو کہیں پہنچیں گے۔ تم اتنا نہ گھبراؤ۔ پہاڑی راستہ سخت بھی ہوتا ہے اور آسان بھی۔ راستے کے بے شمار موڑ مسافر کو نہ آگے کی لمبائی سے ڈراتے ہیں نہ پیچھے کے طے ہو چکے مرحلے دکھاتے ہیں۔"

"مجھے بتاؤ کرمانی کیا کہہ رہا تھا۔" اُس نے دوست کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"میرے خیال میں وہ کینوس کو ترتیب دینے کی بات کر رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟" اُس کا دل ڈولنے لگا۔

"چترکار انسانی خون بہنے کا کارن ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید وہ کائنات کو آنکھ میں بھر لینے کے لیے بے چین تھا۔ کلاکار عجیب بھی ہوتا ہے۔"

"تم تو پہیلیاں ڈالنے لگے"۔ وہ بے چین ہو اُٹھا۔

"وہ سرحد کی نشان دہی اور نگرانی کے بے معنی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا تھا،

دوست نے سر کو جھٹکا دیا۔ "بات میری سمجھ میں بھی اب آنے لگی ہے"۔

"کہتے جاؤ۔ تم رُکتے ہو تو مجھے کوفت ہوتی ہے"۔

"ہر کوئی کہتا ہے ہوا پر کسی کا بس نہیں۔ فضا پر روک نہیں لگائی جا سکتی۔ پھر بھی لوگ دیوار کھڑی کرنے سے باز نہیں آتے۔ اسیم کو سیما میں باندھنے لگتے ہیں۔ لیکن ..."

"لیکن کیا؟"

"جو اسیم ہے وہ ہماری نظر سے پرے تک جاتا ہے۔ ہماری اُس کے خلاف سازش ہماری ہار کا کارن بن جاتی ہے۔ ہم اِس بُو اور چیخ سے ڈرتے ہیں کرپانی نہیں ڈرتا۔ وہ کہتا ہے اتہاس جب کروٹ بدلتا ہے تو چنگھاڑتا ہے۔ اس کی چکی کے پاٹوں کی گڑگڑاہٹ..."

"یہ بات بھیانک ہے۔ ہمیں اِسے روکنا چاہیے۔ چنگھاڑ اور گڑگڑاہٹ کا اِدھر کیا کام؟"

وہ کسمسایا۔

"روکنے سے بات بگڑتی ہے۔ تم بھی تو کہتے ہو ہوا قدرت کی سفیر ہے۔ کرپانی بھی جانتا ہے ہوا اس پار ہو یا اُس پار ہوا کے رُخ پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ شاید ہوا ہی ہماری آزادی کی ضمانت ہے۔ تم بھی تو چترکار کی بات کو درست مانتے ہو"۔ دوست نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بالکل نہیں۔ بوڑھے کو جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اُس کا گیان ہے۔ وہ ہونے والے کے بارے میں نہیں جانتا۔ اُس کا کینوس نہیں دیکھا؟ بکھرا ہوا چتر!"

"عجیب حالت ہے! کرپانی کی بات کو درست نہیں مانو گے تو چوٹی پر پہنچنے کے لیے کیسے تیار ہو گے؟" دوست بڑبڑایا۔ "چوٹی پر پہنچے بغیر نہ ہم ڈھلان کی کہانی سن سکتے ہیں نہ گھاٹی کی کتھا"۔

"تم مورکھ ہو۔ کیا میں نہیں جانتا ڈھلان پر کیا بیت رہی ہے۔ گھاٹی کس حالت میں ہے؟" چوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہتا چلا گیا۔

"اتہاس کا جاگنا یک طرفہ بات نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے اتہاس کے کروٹ بدلنے سے ہریالی پر آگ شروع ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتہاس آنکھ کھولے تو قبرستان چیخ اُٹھے۔ کوڑوں کی بارش ہونے لگے جیل کراہنے لگے۔ پھانسی کا پھندہ مسکرانے لگے۔ چترکار نہیں جانتا اتہاس

کا چلن نیارا ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کو زبان دے سکتا ہے اُس سے آواز چھین سکتا ہے۔ اُنھیں خوشگوار اور خوبصورت زندگی کی جھلک دکھا سکتا ہے۔ اُنھیں محرومی اور لاحاصل کے اندھے غار میں دھکیل سکتا ہے۔ اتہاس کی نہ پوچھو۔ یہ ہمیں اپنے چہرے سجانے کا طریقہ بتا سکتا ہے۔ یہ ہمارے چہرے مسخ کر سکتا ہے۔ اتہاس کالا دیو ہے۔ اتہاس بھولا دیوتا ہے۔ اتہاس کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ من مانی کرنے والا! زہریلی مسکراہٹ! میٹھی جھلاہٹ!....؟

"کہے جاؤ، رکو نہیں۔" دوست بدحواس ہونے لگا۔ "بے شک تم اپنے ہی کو جھٹلاؤ۔"

"بات ایسی نہیں، مَیں اپنے کو نہیں جھٹلا رہا۔ مَیں جو ہے اُسی کا بکھان کر رہا ہوں۔ خون کی بُو جس نے سونگھی چیخ بھی میں نے سُنی۔ کرانی نہیں جانتا زندگی اُس کے کمینوں سے بڑی ہے۔ پہاڑ کے آر پار سے بھی بڑی۔ وہ اتہاس کو انسان کے ہاتھ کا کھلونا سمجھتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم لوگ کسی بھی ایک چیز سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ ترازو کے پلڑے برابر رکھنا چاہتے ہیں۔ اتہاس ظالم ہے۔ وہ یہی نہیں ہونے دیتا۔ وہ کبھی ہمیں ایک چیز سے زیادہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ ورنہ چیخ گیت میں بدل جائے اور بُو خوشبو میں۔" اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔ "دینے والے کے پاس سب کچھ ہے لیکن دینا نہ دینا اُس کی مرضی...!"

"کیا ہم چوٹی پر جانے کا خیال چھوڑ دیں؟" دوست کی آواز میں بیزاری تھی۔

"مَیں وہاں نہیں جاؤں گا۔" وہ سہمی ہوئی نظروں سے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔ "کاش کوئی سرحد کو مہر بند کر دے! اب مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اب میں نہ خون کی بُو کا کارن جاننا چاہتا ہوں نہ انسانی چیخ کا۔ میں تو بس اپنے کمرے میں..."

اُس کے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اُسے شور سُنائی دینے لگا۔ وہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر لوگوں کا بڑھتا ہوا ہجوم تھا۔ سب سے آگے کرانی کھڑا تھا۔ وہ ہجوم سے کہہ رہا تھا:

"تم سب چین سے کھڑے رہو۔ مَیں اندر جاتا ہوں۔ دونوں کو باہر آنے کو کہتا ہوں۔ ہم سب اِن کے ساتھ چوٹی پر چلیں گے۔ اتہاس کو انگڑائی لیتے اور آنکھیں ملتے ہوئے دیکھنے سے زیادہ خوبصورت منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ان دونوں کی قدر کرنی چاہیے۔ انھوں نے ہمیں اتہاس کے جاگنے کی خبر دی۔ ہمیں چوٹی پر پہنچ کر اُس پار کی خبر لینی ہے۔

اِنسانی ہمدردی سرحد کو نہیں مانتی ۔خِطّوں کو پھلانگ جاتی ہے ۔ انسانی خون کی بو کا پھیلاؤ اسیم ہوتا ہے ۔ انسان کے دِل سے نکلی کراہ سیما کو جھٹلاتی چلی جاتی ہے ۔" کرمانی اُرکا" منظر کے ساتھ ساتھ کینوس بھی پھیلتا رہتا ہے ۔ نہیں یہ بات اِنھیں بھی ..."

کرمانی کی آواز سے گھبرا کر اُس نے کھڑکی بند کر دی اور اُس کے آگے پردہ تان دیا ۔ لیکن اُس کے دِل کی دھک دھک وقت کے قدموں کی آہٹ جیسی تھی ۔

منزل

اس بار بھی وہ اکیلا نہ تھا۔ اب بھی اسے سپھلتا کی پوری آشا تھی۔ جو کچھ اس نے بتایا اسے سن کر مجھے پھر وشواس ہو گیا کہ وہ منزل کو پالے گا۔

پہلے بھی وہ دلدل کے پاس پہنچ کر ہی رکتا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس میں اتر جاتا اس کے چہرے پر پھیلی نراشا کو دیکھتا ہوا میں اڑول کھڑا رہتا۔

یہ سب بڑے ویران واتاورن میں ہوتا۔ آس پاس ہلچل ہوتی نہ آواز سنائی دیتی۔ دھرتی ڈولتی نہ آکاش سرٹ پڑتا۔ دلدل ابلتی رہتی اسے نگلتی رہتی۔

اس کے گم ہوتے ہی میں پھر اس جگہ پہنچ جاتا جہاں سے یاترا شروع ہوتی۔

اس بار جو کچھ ہوا اسے دیکھ کر میں سناٹے میں گھر گیا۔ اس نے پکار کر کچھ کہنا چاہا لیکن آواز بیچ میں ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔

یاترا سے پہلے اس نے مجھے بتایا ـــــ اس بار وہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا جس کے کارن اسے پہلے جیسی نراشا کا سامنا کرنا پڑے۔

اپنی سمسیا اور اس کے حل پر اس نے میری رائے پوچھی۔ میں چپ رہا۔

میں کیا کروں ایم ہوتے ہوئے بھی میری اپنی سیما ہے۔ میں اس کے ساتھ چل سکتا ہوں اس کی بات سن سکتا ہوں۔ رائے نہیں دے سکتا۔

یہ جان کر وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر اپنی پچھلی یاتراؤں کا بتاتا ہوا اپنی دھیر بندھانے لگا ـــــ میں نے سب دیکھ لیا ہے۔ جو نہیں دیکھا

اسے بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ کھوئے ہوئے کو پانا اور پائے ہوئے کو کھونا ـــــ دونوں باتیں
غلط ہیں ـــــ اب میں اپنے سوائے کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ پہلے بھی پڑھی پڑھائی
اور سُنی سنائی نے مجھے چکر میں ڈالے رکھا اور میں چلنے کے باوجود راستہ طے نہ کر سکا۔ لیکن
اَب .....

اس بار دلدل سے باہر آیا تو اس میں بڑی لچک اور پھُرتی تھی۔ چہرے پر انوکھی
دمک اور آنکھوں میں عجیب چمک، ہونٹوں پر مسکان اور زبان میں مٹھاس، ہاتھ پاؤں میں
جان اور بازوؤں اور ٹانگوں میں پھڑکن ـــــ اس کے سننے، سونگھنے، محسوس کرنے
دیکھنے اور چکھنے کی شکتی دیکھ کر لگا وہ پوری سرشٹی کو جیت لے گا۔

مجھے اپنے انتظار میں کھڑا دیکھ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تمہارے جیسا
دوست اور کوئی نہیں۔ تم سدا میرے انتظار میں ملے۔ جانے کب سے تم میری سُدھ لیتے
رہے۔"

وہ سامنے پھیلے مارگ کو دیکھنے لگا۔ "تم چنتا نہ کرو۔ اس بار میرے ساتھ ہی تم بھی مُکت
ہو جاؤ گے۔ میرے بار بار دلدل میں گم ہو جانے کا چکر ختم ہو جائے گا..... میں جانتا ہوں
تم یگوں تک میرا ساتھ دے سکتے ہو۔ لیکن مجھے بھی تو کچھ سوچنا چاہیے۔" وہ میری
آنکھوں میں اٹک گیا۔

"میری چنتا چھوڑو۔ اپنی سوچو۔ یاترا کو سپھل بناؤ۔ میرا کیا ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ رہ
کر بھی مکت ہوں اور تم سے بچھڑ کر بھی۔ سچ پوچھو تو میرے لیے مکتی اور بندھن میں کوئی بھید نہیں۔"

میری بات سن کر وہ پھر چہکنے لگا۔ "اب میں نے سب کچھ جان لیا۔ آس پاس کو پہچان
لیا۔ دھرتی کے من میں جھانک کر دیکھ لیا۔ آکاش کا بھی کوئی بھید مجھ سے چھپا نہیں۔ اب
مارگ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ پہلے میں اس کا داس تھا اب یہ میرا داس ہے۔ باہر
اور بھیتر کا گیان معمولی بات نہیں ہوتی۔ شاید یہی آخری بات ہے جیسے....."

مجھے اپنی بات دھیان سے سنتے دیکھ کر وہ جھومنے لگا۔ "پہلے اور بات تھی۔ پرکرتی
پر میرا ایسا ادھیکار نہ تھا۔ اب تو نہ یہ مجھے نچا سکتی ہے، نہ میرا تماشہ دیکھ سکتی ہے نہ مجھے
دلدل میں اُترنے کا آدیش دے سکتی ہے۔" وہ رکا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

"پہلے تو میں اپنے سامنے کے منظر کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا۔ اس کا بننا بگڑنا میری سمجھ میں نہ آتا۔

میں اُلجھن میں پڑ جاتا۔ اُلجھے من کے ساتھ کوئی کتنی دُور جا سکتا ہے؟ اسی لیے تو مارگ مجھ پر سوار ہو جاتا اور مجھے دلدل کے پاس پہنچا کر ہی دم لیتا۔"

اس نے لمبا سانس لیا۔ "میرا کوئی دشمن نہ ہوتا مگر پھر بھی مجھے ہی دوشی ٹھہرایا جاتا۔"

"وہ کیسے؟" میں چونکا۔ "کرم تم کرتے ہو، ڈنڈ بھی تم ہی بھوگتے۔"

"کیسی بات کرتے ہو۔" وہ تڑپ اُٹھا۔ "میں کچھ بھی نہ کرتا میری نظر اپنی پرچھائیں سے آگے نہ جاتی۔ سب کچھ مجھے کبھی نہ حل ہونے والی پہیلی جیسا لگتا۔ میری حالت اس اندھے جیسی تھی جو اپنی ایڑی پر گھومنے کے بعد بھی دشا بتانے کا دعوے کرے۔ لیکن اب..."

"اب کیا؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"اب وہ بات نہیں رہی۔ اب سب کچھ میرے آدھین ہے اور...."

"اور تم؟"

"میں؟" وہ سکپکایا۔ "یہ بھی کوئی سوال ہوا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب یاترا شروع کرو۔"

"تمھیں ابھی شک ہے کہ...." وہ ٹھٹھکا۔ "تم جانتے ہو اس بار میں نے وہ پتنگ نہیں پڑھی جس میں دُور دُور تک پھیلا ریگستان مجھے ڈرا دیتا اور میں اس کے چھوٹے سے نخلستان کے آسرے یاترا شروع کرتا۔"

"اس میں کیا برائی تھی؟"

"تم نہیں جانتے۔ وہ نخلستان ہی میرا دشمن تھا۔ وہ مجھے کہیں کا نہ چھوڑتا۔ بس یہی چاہتا کہ میں اپنا کیا دھرا اس کے ارپت کر دوں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے کو کچھ نہ سمجھوں۔ تم ہی بتاؤ کیا کوئی لاچار آدمی کہیں پہنچ سکتا ہے؟ راہی نہ ہو تو منزل کیسی؟"

"کیا کہتے ہو! وہ شاستر تو...."

"نہیں وہ شاستر میرے کام کا نہیں۔ وہ مجھے اپنے سے باز رہنے کو کہتا ہے۔ لیکن میرا کام ہے کرتی کے گربھ کو ٹٹول کر اس میں چھپے بھید کو جاننا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"پھر بھی تم مجھ پر شک کرتے ہو۔ میری شکتی کا اندازہ لگانے میں اسمرتھ ہو۔ تم نہیں جانتے کہ گرنتھ کی رچنا کرنے والے کے ساتھ کیا بیتی۔"

"کیا کہتے ہو؟"

"میں جھوٹ نہیں کہتا۔ وہ گرنتھ کے انتم ادھیائے پر پہنچ کر گھبرا گیا۔"

"وہ کیوں؟"

"اسے بودھ ہوا کہ گرنتھ میں سوائے اندھکار کے وہ اور کچھ بھی پیدا نہیں کر سکا۔ تم ہی کہو جہاں دھرم پُتر اپنے گورو کا سر کاٹنے کے لیے جھوٹ بولے، کنواری ماں اپنے ہی بیٹے کی جان لینے کے لیے سازش رچے، یودھا اپنے فرض کو بھول کر اپنے بزرگ کی جان لینے کے لیے دھوکہ دھڑی سے کام لے اور خود بھگوان یدھ کو پاپ اور پنیہ میں بھید کیے بغیر جیتنے کا منتر دے وہ گرنتھ کیسا ہو گا۔ رچنا کار نے اسے نرک کنڈ بننے سے بچانے کے لیے اس میں وہ ادھیائے جوڑ دیا جو نخلستان جیسا ہرا بھرا دکھائی دیتا ہے ورنہ..."

"وہی ادھیائے تھکی ہاری، لہو لہان پرکرتی کو..."

"نہیں"۔ وہ چلایا۔ "وہ میرے وناش کا کارن ہے۔ اسی نے مجھے اپنے کو پوری طرح سمجھنے، پرکھنے اور کام میں لانے نہیں دیا۔ اسی کے کارن یاترا مجھے ہر بار دلدل پر پہنچاتی رہی۔" اس نے ادھر کو دیکھا۔ "نخلستان میں پناہ لینے اور صرف اپنے بوتے پر ریگستان کو پار کرنے میں بڑا انتر ہے۔"

اس نے لمبا سانس لیا۔ "وہ ادھیائے سانپ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ میرے من میں میرے تئیں نراشا پیدا کرتا ہے۔ مجھے میری ہی نظر میں کچھ نہیں رہنے دیتا۔ میں بس دیوتا کے چرنوں میں پڑے پرشاد جیسا بن جاتا ہوں۔ اپنی بدھی، جگیاسا اور وکاس سادھنا میں وشواس کھو بیٹھتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں پریشان ہو اٹھا۔

"وہ مجھے وشواس دلاتا ہے کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں یا کر رہا ہوں وہ ہو چکے کو دہرانے کے سمان ہے۔ مثلاً میں صرف مرے ہوئے کو مارنے والا ہوں۔ تم ہی بتاؤ یہ جاننے کے بعد میری کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ میری یہ حیثیت ہی میری سمسیا ہے۔ سوال سرشٹی کے پھیلاؤ کا نہیں سوال اس میں میرے استھان کا ہے۔"

مجھے خاموش نظروں سے اپنے کو تکتے پا کر وہ بولا "مارگ اور منزل میں کوئی بھید

نہیں کرم اور پھل ایک ہی چیز ہیں۔" اس کی آواز تیز ہو گئی" کرم میں تیاگ کی بات مجھے راس نہیں آتی۔ یہ ارپن کیا ہوتا ہے؟ کس کے ارپن؟؟ کس لیے ارپن؟؟؟" وہ رُکا" یہ گیان مجھے یونہی پراپت نہیں ہو گیا۔ میرے ساتھ جو ہوتا آیا ہے اس پر چنتن کرتے یُگ بیت گئے اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں راستے پر قابو پا کر کیسے منزل کو پا سکتا ہوں۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوتا آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم سب جانتے ہو ہمیشہ سے میرے ساتھ ہو۔ پھر بھی انجان بنتے ہو۔" وہ مسکرایا۔

"کیا تم نہیں جانتے ہر بار میری یہ درگت کیوں ہوتی رہی؟ میں منزل کی بجائے دلدل کے پاس کیوں پہنچتا رہا؟"

مجھے سر جھکائے اپنی بات سنتے اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کریدتے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔" جو ہے اسے اپنے آدھین کیے بنا بات نہیں بن سکتی۔ اپنے کو اس کے چرنوں میں رکھ دینا یا مایا جال مان کر اس کی جانب پیٹھ کر کے کھڑے ہو جانے سے میں کہیں نہیں پہنچ سکتا۔ تم ہی بتاؤ۔۔۔ پتھر کو توڑے بغیر ہم اسے ڈھال میں کیسے بدل سکتے ہیں؟ بات سرشٹی کو آگے ماننے کی نہیں اسے اپنے اشارے پر چلانے کی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے اس کی طرف دیکھا ——— "میں کیا کروں۔ میری اپنی سمسیا ہے۔ میں آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا اور کان رکھتے ہوئے بھی بہرہ ہوں۔ میرا سوچنا نہ سوچنا محسوس کرنا نہ محسوس کرنا ایک برابر ہے۔ جس چیز کو دیکھ سکتا ہوں اسے پرکھ نہیں سکتا بات کو سن سکتا ہوں اسے سمجھ نہیں سکتا۔ اس کا بھی کارن ہے۔ سرشٹی میرے ساتھ ہر سمے پوری کی پوری جڑی رہتی ہے۔ میں اس میں اور وہ مجھ میں وچرتی رہتی ہے میرے لیے آدی ورانت میں کوئی بھید نہیں۔ اس لیے یاتری جو بھی کہتا ہے مجھے اس پر وشواس ہو جاتا ہے۔۔۔۔"

"میں نے بتایا تو ہے۔" وہ پھر دور تک دیکھنے لگا۔" کرنی اور ہونی کو بس میں کر لینے کا گُر مجھے آگیا ہے۔ اب میرے کہیں بھی ڈگمگانے کا سوال نہیں رہا۔"

"یعنی کہ۔۔۔۔"

"یعنی کہ ہونہار میری اچھا کا نام اور میرے کرم کا پرینام ہے۔ یہ اب میرے سے پرے کی وستو نہیں رہی۔"

"پھر تم خود ہی منزل ہو۔ تمھیں یاترا کی ضرورت ہی نہیں۔ بیٹھے بٹھائے ہی...."

"نہیں بات ایسی بھی نہیں۔ یُدھ لڑے بغیر کوئی یودھا نہیں کہلا سکتا۔ یاترا کیے بغیر کوئی منزل کا ادھیکاری نہیں بن سکتا۔ اگر میں یاترا نہ کروں تو دلدل کا وجود کبھی نہیں مٹ سکتا۔"

"یہی بات تم نے پچھلی یاترا شروع کرتے سمے کہی لیکن پہلے ہی قدم پر ہار کر بیٹھ گئے۔ اسی لیے رتھ وان کو پہلے تمھیں وراٹ ادھیائے کی یاترا پر لے جانا پڑا۔ سچ بتاؤ شمشان کی جھلک دیکھے بغیر تم موت کے ڈر سے مُکت ہو سکتے تھے؟ پاپ اور پُنیہ کے بیچ کی کھائی کو پاٹ سکتے تھے؟؟"

"پھر وہی بات!" وہ تلملایا۔ "میں نے کہا تو ہے کہ وہ یاترا میری نہیں تھی۔ وہ تو ہونہار تھی۔ میں اسے دہرانے والا کردار تھا، اس کا رچناکار نہیں۔ اسی لیے میں تردھا بھگتی اور وراٹ ہم پن کے چکر میں پھنس گیا۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اب رتھ وان کی بات نہ کرنا۔ اس نے کہا تھا وہ دلدل سے بچنے کا طریقہ بتائے گا۔"

"کیا اس نے غلط کہا تھا؟"

"تم جانتے ہو اس کے بتائے مارگ نے بھی مجھے دلدل پر ہی پہنچایا۔ ختم ہونے کی بجائے دلدل کہیں زیادہ پھیل گئی۔ رتھ وان بھی چھلاوہ نکلا۔ اس کے کہنے کے مطابق کرم کرنے پر بھی مارگ بدلا نہ منزل۔"

"پھر تو اس بار تمھیں رتھ وان کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے رتھ کی بھی ضرورت نہیں۔ اس بار میں اپنے پانو پر چلوں گا۔"

"دیکھ لو، کوئی کمی نہ رہ جائے ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" وہ تمتما اٹھا۔

"ورنہ تمھاری اچھا پھر تمھیں اچھا دھاری سانپ بن کر ڈس لے گی۔ اس کے زہر سے اندھے ہو کر تم پھر دلدل....."

"چپ بھی رہو۔ میرے پاس ہر مصیبت کا علاج ہے۔" اس نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالی۔ "اس میں سانپ کے زہر کا تریاق ہے۔ مجھے پتہ ہے سانپ ہی میری انتم سمسیا ہے۔"

"یہ نئی بات ہے۔ اچھا دھاری سانپ کے زہر کا تریاق تو......؟"

میری بات سُن کر وہ مسکرایا اور کمرے سے نکل کر آنگن میں آگیا۔ وہاں کھڑے برگد کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پھونک ماری۔ آگ کی لپیٹ پورے پیڑ پر چھا گئی دوسرے پل پیڑ جل کر راکھ ہو گیا۔

مجھے ہکّا بکّا کھڑا دیکھ کر وہ ہنسا اور اس سے پہلے کہ راکھ ہوا میں بکھر جاتی اس نے ڈبیہ کھولی۔ اس میں سے چٹکی بھر سفوف لے کر برگد کی جڑ میں ڈال دیا۔ آنکھ جھپکتے ہی برگد پہلے کی طرح لہلہانے لگا۔

"مجھے وشواس ہو گیا کہ تمھیں رتھ کی ضرورت ہے نہ رتھ وان کی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔ بیساکھی کے سہارے چلنے والا لنگڑا کہلاتا ہے۔ لنگڑا نہ تو دوڑ سکتا ہے نہ ناچ ہی سکتا ہے۔ اس کے منزل پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں اس کی کرامات کو دیکھ کر بولا۔

اس بار یاترا لمبی تھی اور کٹھن بھی ۔۔۔۔ پہلے رتھ وان یاتری کی مدد کرتا۔ اسے راستہ سمجھاتا۔ کٹھنائیوں کو دُور کرنے کا طریقہ بتاتا۔ آڑے وقت میں اس کے کام آتا۔ اُداسی اور نراشا میں اس کی دھیر بندھاتا اور اُسے اُڑائے لیے جاتا۔ نہ یاتری کے پانو تھکتے نہ ان میں آبلے ہی پڑتے۔ لیکن اس بار وہ اکیلا ہی سب کچھ سنبھالتا سمیٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اپنی بدھی اور شکتی سے پہاڑ کو دھول، جنگل کو راکھ اور سمندر کو بادل بنا کر اڑاتا ہوا منظر کو اپنے مَن کے مطابق بدلتا چلا گیا۔ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت تھی نہ خواہش۔ وہ تو مجھ سے بھی بیگانہ ہوا مارگ سے بھٹکنے میں مست تھا۔ یہاں تک کہ وہ مارگ کو اور مارگ اُسے چاٹنے لگا۔ مَیں نے کئی بار اُسے اپنی سُدھ لینے کو کہا لیکن اس نے میری بات پر کان نہ دھرے آخر وہ سمے آگیا جب وہ راستے میں اُگی جھاڑیوں کو اپنی کہنیوں سے اکھاڑنے لگا۔

یاترا میں پہلے اس کے پانو گم ہوئے۔ پھر ٹانگیں گھٹنوں تک گھس گئیں۔ ہاتھ کلائیوں کا ساتھ چھوڑ گئے اور بانہ و کہنیوں تک جڑ ہو گئے۔ ریزہ ریزہ بکھرتا ہوا وہ اندھا دھند چلتا گیا۔ ایک ستھان پر پہنچتے ہی سامنے پھیلی ہوئی دھند کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

"اب منزل دُور نہیں۔ اسے پار کرتے ہی......" تبھی اس نے دیکھا میں پیچھے کی طرف دیکھتا

ہوا مسکرا رہا ہوں۔ وہ ٹھٹھکا اور میری طرح گردن گھما کر پیچھے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں پھٹی رہ گئیں۔ پیچھے پہاڑ جوں کا توں کھڑا تھا جنگل لہرا رہا تھا اور سمندر گرج رہا تھا۔ وہ سکتے میں آگیا اور پتھرائی آنکھوں سے آس پاس کو اچھا دھاری سانپ کا روپ دھارن کرتے ہوئے دیکھنے لگا ——— "لگتا ہے ہم وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔ اس بار تو..."

دوسرے ہی پل وہ چیخا اور اسے اپنی جیب میں پڑی ڈبیہ کا خیال آیا۔ لیکن اسے باہر نکال کر کھولنے والے ہاتھ ٹھٹھ بن چکے تھے اور وہاں سے بھاگنے میں مدد دینے والے پاؤں غائب تھے۔ ہر زخم ہڈی تک اُتر گیا تھا۔

دھرت راشٹر کے بعد

سنگھاسن پر بیٹھتے ہی اگھوری اندھ کار میں ڈوب گیا۔
راج دربار کو قہقہہ لگاتے سن اس کی آتما کانپ اُٹھی۔
اُس نے بہت جتن کیا لیکن اس کے من کے پردے پر کوئی چتر نہ اُبھرا۔
وہ اپنے گرو کو یاد کر کے سسک اُٹھا۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔
وہ گرو کے چرنوں میں بڑا ویکشا کی بھیک مانگ رہا تھا۔
گرانڈیل جوان۔ گول چہرہ۔ بھوری آنکھیں۔ سیاہ بال۔
ریشم میں لپٹا شریر۔ اُوپر سے پرتن اندر سے اداس۔

گرو —— چاروں دھام کا گیاتا۔
من کا اک تارا بجاتا
انوکھا گیت گاتا۔
آر پار وہ چیتا رہتا۔
ہونی انہونی کو ساتھ دکھاتا۔

اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے چکنے شریر کو دیکھتا رہا۔ آنکھوں میں بچی کھچی مسکان کو دیکھتا رہا
اور دیکھتا رہا اُس کے گرد سرسراتے ریشم کو۔
تو یہیں پر انجان ہے!

گُرو آسن سے اُٹھا اور اُس کے ریشمی بانے کو تار تار کرنے لگا۔
دوسرے ہی پل پاس کھڑے آشرم باسی نے اُسے ٹاٹ پہنا دیا۔
گُرو نے مارگ بتا دیا

مارگ اور بھی تھے ـــــ
اُسے اگھوری کا مارگ ملا ـــــ
وہ چل پڑا ـــــ

مَن کے چتر پٹ پر چتر اُبھرنے والی بات ایک دم نہیں ہو گئی۔
پہلے کہیں کچھ نہ تھا۔ بس ایک راز۔ گُرو کی آواز:
سنّاٹے یا شور پر من نہ لگانا۔ چلتے جانا۔ یگ نہیں پلٹتا۔ بھرم اُبھرتا رہتا ہے۔ بھرم
سے بچنا۔ بھرم سے بچنا۔

اگھوری چلتا رہا تِل تِل جلتا رہا۔ ٹاٹ میل میں ڈوب گیا۔ اگھوری نے گُرو کا آدیش
نہ بھلایا۔ اُجلے میلے پر من نہ لگایا۔ ٹاٹ کو پانی نہ دکھایا۔ سِدھی کے مارگ پر قدم بڑھایا۔ من
کا چتر پٹ کچھ کچھ اُجلایا۔ اُس پر اُس کے متر کا چتر آیا۔

رجنی کانت ماں کے پیٹ میں تھا جب اُس کا باپ مر گیا۔
باپ کو پاگل کُتّے نے کاٹ لیا۔ ساتویں دن وہ خود پاگل ہو گیا۔ اُس کے منہ سے
جھاگ اُبلنے لگی اور وہ بھونکنے غرّانے لگا۔ جبڑے دکھانے لگا۔ لوگوں نے اُسے کمرے میں
بند کر دیا۔ چھپت پھاڑ کر اُس پر پانی ڈالا۔ پھر اُس کی لاش کو سنبھالا۔

رجنی کانت کی ماں اگھوری کے من کے پردے پر بین ڈالتے ہوئے بیٹے سے

کہتی :

تُو میرے پیٹ میں تھا دُنیا مرے گِرد۔ حوصلہ کر کے میں نے سگے سمبندھیوں کو اپنی

حالت بتائی۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں ہمدردی کی بجائے نفرت اُبھر آئی۔

ماں کانپ اُٹھتی :

اگر تُو باپ کے جانے کے ٹھیک سات مہینے بعد نہ آجاتا تو.....!

وہ رجنی کانت کی آنکھوں میں جھانک کر سُن ہو جاتی :

تُو مسکرا رہا ہے!

رجنی کانت آنکھ نہ جھپکاتا۔ ماں کا دِل بیٹھ جاتا :

تیرا باپ ایسا نہ تھا میری آنکھوں میں بھی کوئی نقص نہیں۔

رجنی بارہ سال کا ہوا تو ماں بھی پرلوک سدھار گئی۔

اناتھ بالک کے دُکھ کی سیما نہیں ہوتی لیکن اُس کی بات نیاری۔

لوگ ارتھی اُٹھانے کی فکر میں وہ مسکرانے کی۔

اناتھ رجنی کانت کو اُس کا ماموں اپنے گھر لے آیا۔

ممانی بانجھ تھی لیکن بھانجے کو دیکھ کر چونک اُٹھتی :

یہ کھلا کھلا لڑکا مجھے ڈراتا ہے۔ میں ممتا کی ماری۔ کیا ہوا جو میری کوکھ ہری نہیں

ہوئی۔ اولاد کو پالنے پوسنے کا موہ تو نہیں مر گیا۔

وہ اپنے آدمی سے ضد کرتی :

دودھ پیتے بچے لاؤ —— ایک لڑکا —— ایک لڑکی۔

وہ رجنی کی آنکھوں پر اٹک جاتی :

جس کے پپوٹے نہ ہلیں اُس سے دُور رہنا چاہیئے۔

رجنی کانت کو ماموں کی بے بسی پر ترس آیا نہ ممانی کی بے رحمی پر غصہ۔

وہ اناتھ آشرم سے آئے ہوئے بچوں کو دیکھتا رہتا۔ ممانی کی سنتا رہتا۔ من ہی من پتہ نہیں کیا ادھیڑتا کیا بنتا رہتا۔

اٹھارہ سال کا تھا جب اُس نے ماموں، ممانی اور معصوم بچوں پر پٹرول اور تارپین کا تیل چھڑک کر دیاسلائی دکھلادی۔ رات کے گھپ اندھیرے کو آگ لگادی۔

لوگ حیران تھے۔ لوگ پریشان تھے۔ اُنھیں معاملے کو جاننے سنبھالنے اور لاشوں کو ٹھکانے لگانے کی فکر۔ رجنی کانت کو مسکراتے گی۔

ماموں کی لاکھوں کی جائداد کا اکیلا وارث رجنی کانت۔ پولیس اور عدالت اُس کے خلاف نہ جاسکی۔ ہتیاؤں کا بھید نہ پاسکی۔

اگھوری جانتا تھا۔
سچ کو پہچانتا تھا۔
وہ دُکھی ہوا نہ تلملایا۔
اُس نے رجنی کانت کا قصہ سرے سے بھلایا۔

اگھوری کا ٹاٹ گلنے لگا۔
دھجی دھجی جھڑنے لگا۔
اُس کے ستھان پر میل کا بانا چڑھنے لگا۔
وہ نہیں جھولا۔
اس نے شریر کو پانی نہ لگایا۔
جو اُس پر چڑھ گیا اُسے نہ ہٹایا۔
سِدھی کی اور ایک قدم اور بڑھایا۔
چندو لال بھرمانے آیا۔
گرو کی آواز آتی رہی۔ مکتی کا مارگ سُجھاتی رہی:
اپنے سے باہر نہ جانا۔ اپنے کو ہی پانا۔ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ دوسروں کا خالی آنچل نہیں بھرسکتا۔ دیکھتی سے پرے کچھ نہیں۔

چندو دلال پیسے کا پُجاری بھگکڑ بن بیٹھا۔ افیون، سونا اور ہیرے اس دیش سے اُس دیش پہنچانے کا نت نیا طریقہ سوچتا۔ سرکار کی آنکھوں میں رشوت کی دھول جھونکتا۔ ایک دن اُسے رشوت دینا اکھرنے لگا۔ لیکن مال اڈے پر کیسے پہنچائے۔ اُسے سرکار کی نظروں سے کیسے بچائے۔

آخر اُس نے طریقہ نکالا۔ اُس کے کارندے گلی محلے گھوم کر گود کھیلتے بچوں کے مرنے کا پتہ لگاتے۔ ماں باپ بچے کو قبر میں اُتار کر چلے جاتے تو کارندے وہاں آتے۔ لاش کو قبر سے نکالتے۔ اُس کے سینے اور پیٹ سے ہڈیاں اور آنتیں نکال کر اُسے کھوکھلا کرتے۔ اُن کی جگہ افیم، سونا اور ہیرے بھرتے۔ لاش کو برقعہ پوش عورت کے حوالے کر دیتے۔ چندو دلال کا کاروبار بڑھنے لگا۔ اُدھر مُردہ بچوں کا اکال پڑنے لگا۔

ایک دن کارندہ زندہ بچہ اُٹھا لایا۔ چندو دلال گھبرایا۔ دوسرے ہی پل اُسے پیسے کے موہ نے بھرمایا۔ کارندے نے بچے کو چیر ڈالا۔

چندو جلدی ہی زندہ اور مُردہ کا انتر بھول گیا۔ دھندہ پھیلنے کی خوشی میں اور بھول گیا۔

مایا نے اُسے اندھا کر دیا۔ اُس نے اپنے پرائے کا انتر پرے دھر دیا۔

ایک دن بڑا سودا نپٹانے کے لیے اُسے گیارہ بچوں کی ضرورت پڑی۔
کارندے دس بچے اُٹھا کر لا سکے۔
گیارہواں بچہ کہاں سے آئے؟
چندو چکرایا۔ لوبھ نے اُسے پھر بھرمایا۔ وہ دفتر سے اُٹھ کر سیدھا گھر آیا۔
گھر میں اُس کی بیوی بیٹے کو چھاتی سے لگائے دودھ پلا رہی تھی۔
چندو اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
بیوی نے اُس کے چہرے پر ناچتے چنڈال کو دیکھا تو تڑپ اُٹھی:
تُو یہ بھی کر سکتا ہے!
ماں نے بیٹے کو گود میں اُٹھا کر پانچویں منزل سے چھلانگ لگا دی۔
اگھوری نہ چندو لال پر تلملایا نہ اُسے ماں اور بچے پر ترس آیا نہ اُس نے کارندوں

پر دوش لگایا۔

اُسے گرو کا وچن یاد آیا:

جو ہو چکا اُسے مُکت من سے دیکھو۔ بیِن ہکال نہ میکھو۔

اگھوری آگے جانے لگا۔

تن پر جمی میل کھانے لگا۔

اُس کا جی متلانے لگا۔

وہ متلی سے من بہلانے لگا۔

اُس نے جنگل میں ڈیرا ڈالا نہ شہر میں وشرام کیا۔

وہ چلتا رہا۔

من کے پردے پر اُجلے چتروں کو ڈھتا رہا۔

چھوٹی موٹی اپنی پرائی گھٹناؤں کے بعد اتیہاس اپنے کو اُس کے من کے چتر پٹ پر انکت کرنے لگا۔ اُس کے اندر اپنے لیے لالسا بھرنے لگا۔ وہ اُسے بہکانے لگا اپنے بارے میں کچھ کہنے کے لیے بھرمانے لگا۔

بھگوان رام نے دھوبی کے لگائے کلنک کے کارن سیتا کو تیاگ دیا۔

اگھوری کہہ سکتا تھا:

دھوبی جھوٹا تھا۔ بھگوان کو ایک بن باس اور بھوگنا چاہیے تھا۔ سیتا رام کے ساتھ چودہ برس جنگلوں کی خاک چھانتی رہی۔ کیا رام اُس کے لیے...

وہ اُس گھٹنا پر بھی اپنی رائے دے سکتا تھا جس میں بھگوان کرشن کی مُرلی کی ٹیر ایک گوپی کو نہ موہ سکی۔ راس لیلا میں نادان دوسری سکھیوں سے الگ بے ہنگم قدم اُٹھانے لگی۔ مُرلی کے سُر اور لَے سے دُور جانے لگی۔ گھبرا کر سکھیوں نے اُسے پکارا:

پگلی! سُر کے رچنا کار کو بناتی ہے۔ اپنی مُور کھتا پر اتراتی ہے۔

بھگوان مُسکراتے رہے۔ مُرلی بجاتے رہے۔ وہ جانتے تھے:

گوپی بے چاری بہری ہے ——

اگھوری سب کچھ شانت من سے دیکھتا رہا۔ اُس نے نہ بھگوان کی ارادھنا کی نہ گوپی کو کوسا۔

اگھوری کا شریر گلنے لگا۔

زخم زخم اُبلنے لگا۔

کبھی کچھِر کبھی بچھو کاٹتا رہا۔

وہ اپنا خون اور پیپ چاٹتا رہا۔

ایک دن آیا۔

اُس نے اپنے کو سانپ سے ڈسوایا۔

شریر نیلا پڑتے ہی من کا بھیدا اور جاگ اٹھا۔

گرو پھر گنگنا اُٹھا:

یہ پڑاؤ ہے منزل نہیں۔ بھرم میں نہ پڑ جانا۔ مرتیو آنے سے پہلے نہ مر جانا۔ مرگ ترشنا سے بچنا۔

گرو بولتا رہا:

یُگ — ست یُگ — کلیُگ — شبد جال — تیرے لیے جنجال — تیری اپنی چال — سب کو بھول اپنے کو سنبھال

گرو ہنکار اٹھا:

تیاگ کو اپنانا — تیاگ ابھیمان سے اپنے کو بچانا — اپنی نگنی سے سمبندھ دور رکھنا۔ کسی دوسرے کو مارگ نہ بھانا — گیانی بھی دھوکا کھاتا ہے، اس کے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔

گرو نے جو کہا وہی ہونے لگا۔ اگھوری کا سو جاگ اٹھا شریر سونے لگا من کے پردے پر ایک کے بعد ایک چتر آتا۔ اگھوری اپنے کو اس سے الگ رکھ کے آزماتا۔ نہ پیدا ہونے والے کی خوشی نہ مرنے والے کا سوگ مناتا — تکمت من۔ مکمت من کی ہانک لگاتا —

اگھوری نے آپ ایسا کچھ دکیا تھا جو اسے ڈستا۔ گرو کے پاس آنے سے پہلے وہ

دوسروں کی کرنی اوڑھ کر روتا۔ اُن کے پاپ اپنے آنسوؤں سے دھوتا ـــــ کہیں مجھ سے ایسا نہ ہو جائے ـــــ سوچ کر ڈرتا رہتا۔ پاپ سے بچنے کا اُپائے کرتا رہتا ـــــ

اب اور بات تھی۔

اب ہو چکی اور ہو رہی اُسے اشانت نہ کر پاتیں۔

وہ اُس کے سامنے نرمنڈیوں کا مینار سجاتیں۔ بچوں کی توتلی زبانیں کٹوا تیں۔ نیپام بم برساتیں۔ آبادیوں کو ویرانے بناتیں۔ ہو چکے کو بار بار دُہراتیں۔ اُس کے آگے آگ اور لہو کا دریا لہراتیں ـــــ

اگھوری اشانت نہ ہوتا۔ من کا دھیرج نہ کھوتا۔ اُسے کسی گھٹنا، دُرگھٹنا کو پرکھنے کا ساہس نہ ہوتا۔ نہ وہ ہنستا نہ روتا ـــــ

وہ اگلی سیڑھی کے انتظار میں تھا:

ہونہار ہونے سے پہلے من کے چترپٹ پر نہیں اُبھرتی۔!

آخر وہ سمے بھی آیا۔ اگھوری نے یاترا کے انتم چرن کی اور قدم بڑھایا۔

ئل مُوتر اور دانہ پانی کا انتر بُھولتے ہی اُس کا من پُوری طرح چمک اُٹھا۔ اُس کے سامنے برہمانڈ دمک اُٹھا۔ ہو چکی، ہو رہی کے ساتھ ساتھ ہونے والی بھی اُس کے سامنے لہرانے لگی۔ سرشٹی اُسے پورن رُوپ دکھانے لگی۔

گُرو نے انتم بار سمجھایا:

ساگر پار کرنے کی شکتی رکھنے والا ندی میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔

اپنے کو بھول کر بھرم میں بہہ جاتا ہے۔

تُو ساگر اور ندی دونوں سے مکت ہو جا۔ اپنے میں ڈوب جا، اپنے میں کھو جا۔

بات انجانی نگری کی سیما پہ پہنچنے کے بعد کی۔

اگھوری کو اپنی سادھنا اور سدھی پہ وشواس ہونے لگا۔

وہ جہاں بھی جاتا اتہاس کو اپنے کو دُہراتے پاتا۔

وہی خنجر کی چمک اور لاشوں کی کھیتی۔

وہی حیوانیت کی چنگھاڑ اور انسانیت کی پناہ کے لیے پکار۔
یہ سب تو وہ کبھی کا من سے اُتار چکا۔
بار بار یہی ہوتا ہے تو اُس کی کوئی سمیا نہیں۔

لیکن انجانی نگری کی سیما پر پہنچتے ہی سب گڑبڑانے لگا۔
اگھوری وہاں کی ہونہار سے اپنے کو بچانے لگا۔
اُسے من کے پردے پر اُبھرتے ہی مٹانے لگا۔

بات معمولی تھی لیکن تھی انوکھی۔
اگھوری نے بچنے کا لاکھ جتن کیا پھر بھی نگری نے اُسے جکڑ لیا۔
کیا یہ پہلے نہیں ہو چکا ——— اگھوری سٹ پٹایا ——— اُس نے اتہاس کو ایک سرے سے لے کر دوسرے تک من کے پتر پٹ پر پھیلایا۔ وہ گھٹنا گھٹنا گھومنے لگا۔ ہونے والی کو ہو چکی میں ڈھونڈنے لگا۔ وہ سپھل نہ ہوا۔

کیا ہوا جو راجہ اندھا ہے؟
اگھوری نے اپنے کو سمجھایا۔
اندھا دھرت راشٹر بھی تھا۔
دھرت راشٹر کے دربار میں دروپدی کا چیر ہرن بھی اگھوری کو اشانت نہ کر سکا۔ وہ اُسے ہونی لور کرنی کہہ کر ٹال گیا۔ نگری میں سانجھ تک ہونے والی گھٹنا اُس پر کیوں سوار ہو بیٹھی؟

دکھی آنکھوں والے بھی تھے لیکن وہ پاپ کا آپچار پاپ سے کرنے میں سمرتھ تھے۔
اندھوں کی بات الگ۔
اُن کا ہونا نہ ہونا ایک سمان۔ نہ اپنا جی نہ اپنا پہچان۔ آس پاس، اوپر نیچے ویران۔
نہ سمت کی سمجھ نہ دشا کی پہچان۔
اُن کے نام پر اکٹھا ہو اَن، سرکار کی اور سے بلا اُن ولاس ادھیکاری کے لیے وردان۔

اندھوں کو پیٹ بھر بھوجن ملتا نہ تن بھر کپڑا۔ انھوں نے راجہ کے آگے فریاد کرنے کی ٹھانی۔

اندھے جلوس بنا کر آشرم سے باہر آئے۔

ادھیکاری چونکا:

راجہ کیا کہے گا۔ وہ یہ کیسے سہے گا۔ میری کھال اُتروا دے گا۔ مجھے کُتوں سے نُچوا دے گا

——میں اندھوں کو بھی نہ سنبھال سکا؟

اُس نے سپاہیوں کی ٹکڑی بُلائی۔

اندھوں کو راج سَتا کی للکار سُنائی

اندھے نہ مانے۔

ادھیکاری راج دربار میں پہنچا کہ راجہ سے اندھوں پر لاٹھی برسانے کی آگیا پراپت کرے۔

ہونہار کے یہاں پہنچتے ہی اگھوری بیاکل ہو اُٹھا:

مجھے راج دربار جا کر راجہ کو روکنا چاہیے۔ ادھیکاری کو ٹوکنا چا۔

اندھے کو کیا معلوم اُس کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔

لاٹھی کدھر سے آئے گی، کون سے انگ پر چوٹ پہنچائے گی۔

وہ چہرہ بچائے گا چوٹ پیٹ پر کھائے گا۔

اتیا چار، اگھور اتیا چار!!

اگھوری چلّایا۔ اُس نے گرو کا اُپدیش بھلایا۔

مجھے اتنا تو کرنا چاہیے۔ اندھوں کا دم بھرنا چاہیے۔ راج دربار تک جانے میں کوئی ہانی نہیں۔ راجہ کو سمجھانے میں کوئی ہانی نہیں۔

اگھوری راجہ کے دربار میں پہنچا تو ساتھ پچھ چکا تھی۔

ادھیکاری راجہ کے سامنے کھڑا اندھوں پر لاٹھی چلانے کی آگیا مانگ رہا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی اگھوری چلّایا :

راجن! یہ کیسا دمن چکّر چلایا۔ اندھوں تک کو.....!

راجہ اگھوری کی بات سُن کر مسکرایا :

بھگوان! میں اندھا ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

راجہ نے ہاتھ جوڑ لیے :

بھگوان! اپنی سِدھی کا چمتکار دِکھاؤ۔ میری آنکھوں کی روشنی واپس دلاؤ..

میں بدلے میں راج پاٹ آپ کو دے دوں گا۔ آپ اسے چلانا۔

تھوڑا سوچ کر اگھوری مان گیا۔ اُسے لگا راجہ سادھنا کا اور سادھو راج سَتّا کا گُن

جان گیا :

سنگھاسن پر بیٹھے بنا میں اندھوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

عجیب تماشہ تھا۔

راجہ نے یُونہی سنگھاسن چھوڑا اُس کی آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی۔

اگھوری سنگھاسن پر بیٹھتے ہی آنکھیں کھو بیٹھا۔

اُس کے من کا چِترپٹ اندھکار میں ڈوب گیا۔

دوسرے ہی پل اُس نے ادھیکاری کو اندھوں پر لاٹھی چلانے کی آگیا دے دی۔

●

کاویری

دُنیا جہان کی باتیں کرتے ہوئے وہ عورت کو لے بیٹھا۔

ٹیڑھی میڑھی پہاڑی سڑک پر پل پل موڑ کاٹتی بس میں وہی بول رہا تھا۔

اُس کے ساتھ بیٹھا میں حیران تھا کہ وہ پہاڑ کی خاموش سُندرتا کا آنند لینے آیا ہے یا اپنی باتوں کی گمان پٹاری کھول کر دکھانے۔

سڑک کی دائیں طرف کھڑے پہاڑ پر شام کے دُھندلکے میں کالی پڑتی ہوئی ہریالی اور بائیں طرف کھڈ میں بہتی ندی کا وِلاپ میں بدلتا ہوا سنگیت اور اس کے پرلے چھور پر چوٹیوں کی برف میں دم توڑتی سُنہری کرنیں۔ میں دن کی مٹتی روپ ریکھا کی اُداسی میں گم ہو جانے کے لیے بے چین، وہ سب کچھ نظر انداز کر کے اپنی کہے جانے پر تُلا ہوا۔

وہ رماکانت کی بیوی لاجونتی کی کہانی سُنانے لگا۔

لاجونتی نیک اور پارسا عورت تھی۔ بتی پر جان چھڑکنے والی۔ گھر گرہستی کو سنبھالنے سنوارنے میں مست۔ دو بچوں کی ماں۔ دُکھ کلیش سے دُور۔

ایک رات سپنے میں اس کی شادی ساتھ والے مکان کے سیٹھ دینا ناتھ کے بیٹے سے ہو گئی۔ رماکانت خود اسے منڈپ میں بٹھا آیا۔ وہ چلاتی رہی کہ اس کا پتی زندہ ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں۔ لیکن اس کی چیخ و پکار نہ دوسروں نے سُنی نہ رماکانت نے۔

ہمیں اپنی بات چُپ سُنتے دیکھ کر وہ چلّایا:
معصوم عورت نے صبح ہوتے ہی سپنے کی بات پتی کو سُنائی اور مُسکرانے لگی۔ رماکانت بات سُنتا رہا۔ چائے پیتا رہا۔
شام کو کام سے لوٹ کر آیا تو بڑا اداس تھا۔ اس نے دونوں بچوں کو کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا۔
دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاجونتی کو فرش پر گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ "میں نے تمھیں لگن منڈپ میں بٹھایا تھا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔۔۔ شادی میرے ساتھ اور ریاری بیٹھو کے بیٹے۔"
اس سے پہلے کہ رماکانت بات پوری کرتا لاجونتی نے تڑپ کر اُسے پرے ڈھکیل دیا۔ وہ اٹھی اور رسوئی میں جا کر سبزی کاٹنے والا چاقو اُٹھا لائی۔ چاقو رماکانت کے ہاتھ میں تھما کر اس نے گھرنا بھری نظروں سے پتی کی اور دیکھا اور گردن کو ذرا ٹیڑھا کر کے اپنی شہ رگ اس کے آگے کر دی۔۔۔ "اسے تم کاٹو گے یا میں اپنے ہاتھ سے۔۔۔۔؟"
وہ خاموش ہو گیا تو ہم سب چلّائے:
"کیا رماکانت نے سچ مچ۔۔۔۔۔؟"
"نہیں وہ ایسا نہ کر سکا۔ لیکن۔۔۔۔۔"
"لیکن کیا؟"
"لیکن لاجونتی ایک ہفتے سے زیادہ نہ رہی۔ ایک دن اس کے پیٹ میں درد اٹھا اور وہ دوا دارو ہونے سے پہلے ہی چل بسی۔"

ہمیں لمبا سانس لیتے دیکھ کر وہ ایک اور قصہ لے بیٹھا:
ایک عورت کا پتی، بیٹا اور بھائی قتل کے جرم میں پکڑے گئے۔ انھیں راجہ کے سامنے لایا گیا۔ راجہ دچتر آدمی تھا۔ اس نے عورت کو بلا بھیجا:
"تم تینوں میں سے ایک کی جان بچا سکتی ہو۔ بتاؤ تمھیں کون پیارا ہے؟"
اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے ہمیں انومان لگانے کے لیے چھوڑ دیا۔
میرا من بار بار باپ اور بیٹے کی اور جاتا۔ بھائی بے چارہ اس عورت کے کس کام کا۔ پتی روزی روٹی لانے والا، بیٹا کوکھ کی دہائی دینے والا۔

جانتے ہو اس عورت نے کس کی جان بخشنے کے لیے کہا۔

ہم ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے بس بھی رُک کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

اس عورت نے راجہ سے اپنے بھائی کی جان بخش دینے کو کہا۔

راجہ کو حیرت میں ڈوبا دیکھ کر وہ گمبھیر آواز میں بولی:

"دوسرا پتی پراپت کرنے میں مجھے دقت نہ ہوگی۔ پتی کے ملتے ہی میری جوان کوکھ پھر سے ہری ہو جائے گی۔" وہ اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی "اسے میں دوبارہ پراپت نہیں کر سکتی۔ ماں مر چکی ہے۔"

میں سچ کہتا ہوں عورت کے بارے میں اتنا کچھ سننے پر بھی مجھے کادیری کا خیال تک نہیں آیا۔ میرا اس کے ساتھ سمبندھ ہی کیا تھا! بیس برس پہلے میں سونالی میں اسے اس کے پتی کے ساتھ ملا تھا۔ ایسے تو میں پتہ نہیں کتنے لوگوں سے ملا اور بھول گیا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں میں سونالی کادیری کو ڈھونڈنے نہیں جا رہا تھا۔

رات پڑ گئی۔ گھنے بادلوں نے پہاڑی سفر کو اور بھیانک بنا دیا جنگل سائیں سائیں کرنے لگا اور ندی بین ڈالنے لگی۔ بس کے مسافر منزل پر پہنچنے کے لیے بے چین۔ وہ اپنی سنانے پر اُوا ہوا۔

"باقی راستہ بھی عورت کی سنگت میں کاٹیں گے۔" وہ مجھے کہنی مار کر بولا:

دیپالی ناگ دیشیا تھی لیکن اسے پستک سے موہ تھا پیشہ کرنے کے ساتھ ساتھ پستک بھی پڑھتی رہتی۔ اپنی لگن اور محنت سے اس نے یونیورسٹی کی سب سے بڑی ڈگری پراپت کر لی۔

ایک دن صبح سویرے بنارس کے گھاٹ پر اشنان کرنے گئی۔ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی وہاں تھا۔ دیپالی ناگ اس کے قدموں میں جھک گئی۔ وائس چانسلر کو اس کی ڈگری اور لہجے نے پگھلا دیا۔ اس نے اسے یونیورسٹی میں نوکری دے دی۔ دیپالی ناگ نے اسے اپنے دیشیا ہونے کا نہیں بتایا۔ اپنا دھندا ضرور چھوڑ دیا۔

بات چھپی نہ رہی۔ وائس چانسلر کو پتا چلا تو اس کے غصے اور ندامت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دندناتا ہوا دیپالی ناگ کے پاس پہنچا:

"ایک دیشیا یونیورسٹی میں لڑکیوں کو پڑھائے! گھور پاپ!"

غصے سے ہی بل وہ ڈھیلا پڑ گیا:

"دیپالی! تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

دیپالی ناگ مسکرائی:

"آپ مجھے یونیورسٹی کا چانسلر بنا دیجئے۔"

مجھے سٹ پٹاتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا:

"شانتا کو جانتے ہو؟" وہ گمبھیر ہو گیا، "تم نہیں جانتے۔ بڑی عجیب لڑکی تھی۔ راہل سے پیار تھا اس کو۔ کہتی تھی راہل نہیں تو میں بھی نہیں۔ راہل کو کینسر ہو گیا۔ بیماری کے بڑھتے ہی اس نے کراہنا شروع کیا تو شانتا سوچ میں پڑ گئی —— اتنی بھیانک کراہ —— ! ایک دن وہ ڈاکٹر کو لے کر آئی۔ اس نے راہل کو زہر کا ٹیکہ لگوا دیا —— اس کراہ کے ساتھ جیون بتانے سے اچھا ہے میں اس کی یاد کے سہارے زندگی کاٹ دوں ——

بارش تیز ہو گئی۔ بادل گرجنے لگا۔ بجلی چمکنے لگی۔

بس سونالی کی چڑھائی چڑھنے لگی۔

اس نے بولنا بند نہیں کیا۔ مسافر اپنے میں ڈوب گئے۔ وہ بات کے بعد بات سناتا رہا۔ مجھے کچھ نہ کچھ بتاتا رہا۔

پھر بھی یہ سچ ہے کہ مجھے کاویری کا خیال تک نہیں آیا۔ خیال تو مجھے چندر کا بھی نہیں آیا جو سونالی میں ہوٹل چلاتا۔ من چلے نوجوانوں کو اپنے ہوٹل میں ٹھہراتا۔ ان سے وصول کیا ہوا کرایہ ان کی آؤ بھگت پر خرچ ڈالتا۔

ادھر پچھلے بیس برس میں پتہ نہیں کیا کچھ بیت گیا۔ میں بدیش یاترا کر آیا۔ دیش میں کاروبار کو پھیلا کر ایک بڑی کمپنی کا روپ دینے میں پھل ہو گیا۔ لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

سونالی کی یاترا کا خیال تو پچھلے ہفتے ہی آیا اور میں اکیلا ہی چل پڑا۔ کار اور شوفر کی سنگت بھی سہن نہ ہوئی۔

میں قسم کھاتا ہوں میرے سونالی اکیلا جانے میں کاویری، چندر، چندر کے ہوٹل کے بیرے علیہ کا کوئی ہاتھ نہیں۔

علیہ تھا تو بیرا لیکن مالک سے زیادہ چلتی تھی اس کی چندر بیچارے کو کیا پتہ پیسہ کمانا، دیر بھانا کسے کہتے ہیں۔ میں ہوٹل میں اترا اور چندر شام ہوتے ہی مجھے ساتھ لے کر کلب کو چل دیا۔ آدھا راستہ طے کرنے سے پہلے ہی اس نے مجھے گاہک کی بجائے اپنا دوست بنا لیا۔

"چھوڑو کرائے ورائے کی بات۔ تم میرے بھائی ہو نہیں! دوست ہو۔ گاہک آتے رہتے ہیں۔"

وہ مڑ کر میرے چہرے کو دیکھنے لگا، "تم جیسے معصوم آدمی سے پیسے کمانا ......!"

چندر ہر شام مجھے کلب لے جانے لگا

سڑک کے دونوں طرف بازار اور ہوٹل۔ بائیں طرف ذرا نیچے اُتر کر بہتی گنگناتی ندی۔ ندی کے عین بیچ کھڑا کلب۔ لکڑی کے کمرے اور بالکونیاں۔ ان تک پہنچنے کے لکڑی کے ستونوں پر کھڑے چھوٹے چھوٹے پل۔ کیا نظارہ تھا! پہاڑ کی چوٹی پر جما پانی، پہاڑ کے دامن میں بہتا پانی۔ بیچ میں کھڑا ان گنت پیڑوں کا لشکر۔

شام کو سورج چھپنے تک ہم بالکونی میں بیٹھے شراب پیتے رہتے جنگل اور ندی کے اندھکار میں ڈوبتے ہی اُٹھ کر کلب کی بار میں جا بیٹھتے۔ تھوڑی دیر بعد چندر گنگنانے لگتا۔ کلب میں بیٹھے مرد اور عورتیں اسے سننے لگتے۔

مجھے بھی گانے کا شوق تھا۔ سُریلی آنچ دار آواز جذبات میں بھیگی ہوئی۔ چند روز میں ہی میں کلب کا ہیرو بن بیٹھا۔ لوگ اپنے ٹیبل چھوڑ کر ہاتھوں میں جام تھامے میرے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ میں گاتا رہتا وہ میرا ساتھ دیتے رہتے۔ رات ڈھلتی چلی جاتی اور ہم اس کی اُداسی میں شریک ہوتے جاتے۔ کبھی کبھی بار کا ٹھیکے دار بوڑھا سردار مستی کے عالم میں آ کھڑا ہوتا۔ پیگ ہر کسی کو اپنی طرف سے پیش کرتا اور ہال کے بیچ ناچنے لگتا۔

ایک شام محفل شروع ہونے سے پہلے ایک نوجوان بار میں داخل ہوا۔ وہ ملٹری یونیفارم میں تھا۔ اس کے ساتھ تھی موسم کے پھول کی طرح کھلی سنوری اور جوانی کے نشے میں چور رکا دیری۔

انھیں دیکھتے ہی چندر اپنی سیٹ سے اُٹھ کر نوجوان کی طرف لپکا:

"کیپٹن کپور! کرائے شادی!" پھر اس نے کادیری کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دئے "آج کی محفل آپکے نام!"

ٹھیکے دار بھی بوتل کھلی چھوڑ کر ادھر گیا اور رکادیری کو آشیرواد دینے لگا۔

میں جوڑی کو دیکھتا رہ گیا۔

کپور لمبا تڑنگا بارعب نوجوان۔ چھوٹی چھوٹی بھوری مونچھیں ہونٹوں کے کونوں کو ذرا پار کرتی ہوئیں۔ گول چکنا چہرہ۔ چوڑا ماتھا۔ سر پر گھنے کالے باریک تراش کے بال۔

مجھے سب کچھ بڑا پیارا لگا۔ صرف اس کی آنکھوں میں دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ فوجی کی آنکھوں میں حیوانیت نظر آئی ——— میں نے سوچا اور رکادیری کی طرف مُڑ گیا۔ ——— خدا سب سے بڑا بت تراش ہے ——— میرے من نے کہا ——— اسے بھی حسن پیارا ہے۔ عورت! خدا کی کلپنا کی سُندرتا کا اتم رُوپ!

کپور نے دوسرا پیگ ختم کیا تو چندر گانے لگا۔ اس دن وہ نہیں جما۔ لوگ اس کا گانا سُننے کی بجائے کپور اور کادیری کو دیکھتے رہے۔ اکتا کر چندر نے ایک پیگ کا اور آرڈر دیا اور پہلا گھونٹ بھرتے ہی مجھے گانا شروع کرنے کو کہا۔

دوسرے ہی پل پہاڑی دُھن میں ڈوبے شبد بار میں اپنا جال پھیلانے لگے۔ لوگ میرے گرد اکٹھے ہو کر سُر میں سُر ملانے لگے۔ وہ زمیں آکر جھومنے لگے۔ گیت جوبن پر آیا تو کادیری کے ہونٹ بھی ہلنے لگے۔ مجھے ہوش نہ تھا میں آواز کو غمگین بناتا گیا۔ سُر اور تال کا سرور مجھے سرشاری کی آخری منزل کی اور لے چلا۔ تبھی مجھے لگا باقی سب لوگ خاموش ہو گئے ہیں صرف میں اور کادیری گا رہے تھے۔ چندر میز کو بجا کر تھاپ دے رہا تھا شاید دوسرے لوگوں کو اسی نے روک دیا۔

گیت کے انتم بول واتاورن میں گونجنے ہی کو تھے کہ کپور چیخ اُٹھا:

"بند کرو یہ ناٹک!"

میں نے دیکھا وہ سفاک نظروں سے کادیری کو گھورتا ہوا اپنے کو سنبھالنے کا جتن کر رہا ہے۔ دوسرے ہی پل کادیری کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا وہ بار سے باہر جانے لگا۔ اسی وقت علیہ بار میں داخل ہوا۔ وہ مجھے اور چندر کو پکڑ کر بار کے دوسرے دروازے سے باہر لے گیا۔

"صاب! تم کپور کو نہیں جانتا۔ اکّ بھی اسے نہیں پہچانتا۔" راستے میں علیہ بولنے لگا۔ "ایسے آدمی کا بھروسہ نہیں۔ موج میں آئے تو سب کچھ لٹا دے، من نہ ہو تو بات کا بتنگڑ بنا دے۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔ "تم پہاڑی عورت کو نہیں جانتا!" وہ ٹھٹکا۔ "پہاڑ پر آکر ہر عورت پہاڑی بن جاتی ہے۔"

وہ کہانی سُنانے لگا:

ہمارے گاؤں کی بات ہے۔ رضی جوان اور خوبصورت تھی۔ باپ نے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف گاؤں کے مولوی سے کر دی۔ رضی نے مولوی کو شادی کرنے سے باز رہنے کو کہا۔ فریاد اس نے گاؤں کے مکھیا سے بھی کی لیکن اس کی کسی نے نہ سُنی۔

شادی سے چند روز پہلے رضی کو پاگل پن کا دورہ پڑا۔ لوگوں نے کہا اسے بھوت نے بس میں کر لیا ہے۔ مولوی مسکرایا۔

"میں جن بھوت کا علاج جانتا ہوں۔"

سہاگ کی رات مولوی رضی کے ساتھ جا لیٹا۔ کمرے میں چارپائی سے دس فٹ کے فاصلے پر دیا جل رہا تھا۔

رضی نے مولوی کو دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں پتہ نہیں کیا تھا مولوی اندر تک کانپ اٹھا۔
تبھی رضی نے کہا:
"دیے کی لو میں کچھ نہیں ہو سکتا۔"
مولوی دیا بجھانے کے لیے اٹھنے لگا۔ رضی نے روک دیا۔ پھر اس نے لیٹے لیٹے اپنا بازو لمبا کیا اور ہاتھ سے دیا بجھا دیا۔
رضی کے بازو کو دس فٹ لمبا ہوتے دیکھ کر مولوی کا دم رک گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔
مجھے علیہ کی بات میں کوئی تک نظر نہ آئی۔ کاویری کا رضی سے کیا میل؟ چندر نے شاید کچھ بھی نہ سنا۔ وہ لاپرواہی سے چڑھائی چڑھتا رہا۔ علیہ بڑبڑاتا رہا۔

دوسرے دن شام ہونے سے بہت پہلے کپور اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل میں آدھمکا۔
اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا بڑا سا کین تھا۔ آتے ہی اس نے کاویری کو میرے بائیں پہلو میں بٹھا دیا۔ خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک مجھے گھورتے رہنے کے بعد اس نے کین میز پر رکھ دیا:
"آج محفل یہیں جمے گی۔" اس نے چندر سے کہا۔
علیہ گلاس لے آیا تو وہ کین کھولنے لگا۔
کین رم سے بھرا ہوا تھا۔
"مجھے علیہ نے بتایا ہے تم خاصے پیکڑ ہو۔"
کیپٹن پیگ بھرتا جاتا شراب حلق میں اتارتا جاتا اور ایک ہی جملہ دہراتا جاتا:
"سنا ہے تم خاصے پیکڑ ہو۔"
پانچویں پیگ کے بعد میں نے محسوس کیا وہ میرے ساتھ شراب پینے کے مقابلے میں لگا ہے۔ بار بار کاویری کی طرف دیکھتا ہوا ہونٹ پھڑکا رہا ہے۔
میرے لیے اپنے بازو میں بیٹھی کاویری کو دیکھنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی میں نے دو تین بار چور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ سہمی ہوئی کبوتری کی طرح کیپٹن کو دیکھے جا رہی تھی۔

ساتواں پیگ منہ سے لگاتے ہی کیپٹن کا برا حال ہو گیا۔

شراب اس کے پیٹ میں جانے کی بجائے اس کے منہ اور نتھنوں سے باہر آنے لگی۔ ٹھوڑی اور گردن سے ہوتی ہوئی وہ اس کے کپڑے بھگونے لگی۔ گلاس ہاتھ میں تھامے اور کادیری پر نظریں جمائے وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔

علیہ کپٹن کو کیمپ تک چھوڑنے کادیری کے ساتھ گیا۔

دوسرے دن صبح اٹھا تو میں نے دیکھا میرا سامان بندھا پڑا ہے۔

علیہ ہاتھ باندھے کھڑا ہے:

"صاب! پہلی بس پکڑ لو" اس نے ٹکٹ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے چندر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ پاس کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔

یہ سب میں اب بتا رہا ہوں۔

اس دن سفر میں ہمسفر کی باتیں سنتے ہوئے مجھے کادیری، کپور، چندر اور علیہ کا خیال تک نہیں آیا۔

وہ عورت کی پر تیں کھولتا رہا۔ طوفان تولتا رہا۔ میں سنتا رہا۔ ان سنی کرتا رہا۔

سنسار میں ایسا بھی ہوتا ہے یہ مجھے سونالی پہنچ کر پتہ چلا۔

بس سونالی پہنچی۔ گہری کالی رات۔ بارش زوروں پر۔ میں جھٹ سے ایک ہوٹل گائیڈ کے ساتھ ہو لیا۔

ہوٹل میرے من کے مطابق نہ تھا۔ صبح ہوتے ہی ناشتہ کر کے میں سڑک پر نکل آیا تاکہ دوسرا ٹھکانہ دیکھوں۔

ابھی تک مجھے بیتی ہوئی گھٹنا یاد نہ آئی۔ اگر مجھے علیہ نہ ملتا تو شاید کبھی یاد نہ آتی۔ لیکن علیہ!

آدھا بازار پار کرتے ہی میں نے دیکھا سڑک کی پہلی پٹری پر کھڑا ایک بوڑھا مجھے پکار رہا ہے:

"رمن صاب! رمن صاب!"

آواز کمزور لیکن جانی پہچانی لگی۔ غور سے دیکھنے پر بوڑھے کی شکل بھی بیگانی نہ لگی۔ میں سڑک پار کرنے لگا۔ بوڑھا بھی تیزی سے میری طرف لپکا۔ دوسرے ہی پل وہ مجھ سے لپٹ گیا:

"صاب! مجھے نہیں پہچانا؟"

"علیہ!"

علیہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا:

"صاب اچھا ہوا میں نے اس دن تمھیں پہلی بس سے بھیج دیا۔ دوپہر کو کپور دو گھوڑے لے کر آیا۔ تمھیں پوچھنے لگا۔ اس کا کیا پتہ؟ اگلے دن وہ پستول لے کر آجاتا!" وہ مجھے روک کر کھڑا ہو گیا:
مجھے اُلجھن میں پڑتے دیکھ کر وہ بولنے لگا:

"تمھیں غائب پا کر کپتان کی آنکھیں بجھ گئیں۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے کی لگام پکڑ کر اسے ساتھ دوڑانے لگا۔ بازار پار کرتے ہی دونوں گھوڑے بے قابو ہو گئے۔ کپتان کاٹھی سے لڑھک گیا۔ اس کا ایک پاؤں رکاب میں پھنس گیا۔ گھوڑا اُسے گھسیٹتا ہوا بھاگتا رہا۔ کپتان کا سر سڑک سے ٹکراتا رہا۔ جب تک لوگ گھوڑے کو قابو میں لائے وہ مر چکا تھا۔

"اور کادیری؟"

علیہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا:

"مالکن کی نہ پوچھو صاب!" اس نے لمبا سانس لیا۔ "کپتان کے جانے کے بعد مالکن یہیں رہ گئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا بنگلہ خرید لیا" وہ ہاتھ سے پہاڑ کی ڈھلان پر بنے بنگلوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ "مالکن سردی ہو یا گرمی وہیں رہتی ہے۔" علیہ جیسے اپنے پر قابو پا کر بولا "صاب! شام کو کلب میرے ساتھ چلنا۔ میں آپ کو لینے آؤں گا۔"

علیہ نے میرے ٹھکانے کا پوچھا اور چل دیا۔ میں نے ہوٹل بدلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

کلب میں خاصی رونق تھی۔ لوگ شراب پینے میں مست۔ باتیں کرنے میں گُم۔

علیہ مجھے بار کے دائیں کونے کی اور لے چلا۔ میں نے دیکھا وہاں میز کے گرد پڑی دو کرسیوں میں سے ایک خالی تھی۔ دوسری پر بیٹھی عورت کھلتے ہوئے گہرے لال رنگ کی اُون سے سوئیٹر بن رہی تھی۔ ہماری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اس کے جوڑے میں لگا سرخ پھول اس کے بالوں میں پھیلی چاندنی کو نمایاں کر رہا تھا۔

میز سے ذرا اِدھر رُک کر علیہ نے کہا۔

"مالکن!"

"کادیری!" میرا من ہوک اُٹھا۔

دوسرے ہی لمحے میں کادیری کے سامنے کھڑا تھا:

"کادیری!"

اپنا نام سن کر کادیری نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ پگھلتے حسن پر چڑھی سنہری فریم کی عینک کے شیشوں کے پیچھے جگیا سا سے بھری آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری پھر مسکان۔

"تم آگئے؟" کادیری آدن کو سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پتہ نہیں کب تک وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتی رہی اور میں بھی اسے ڈھونڈتا رہا۔

"آؤ" کادیری مجھے بار کے ساتھ والے کمرے کی طرف لے چلی۔

کمرے میں ایک میز کے گرد بیٹھے چار لڑکے کیرم کھیل رہے تھے۔ عمر اٹھارہ یا بیس سال۔ صحت مند، تروتازہ، ہشاش بشاش۔

ان میں سے ایک لڑکے نے لال رنگ کا سوئیٹر پہنا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے بازی کھیلنے میں مست تھا۔

"وہ" کادیری نے ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کیا۔

میں میز کی طرف لپکا۔ لڑکے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسی دم اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گیئں۔ مجھے لگا میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوں اور میری عمر انیس سال ہے۔

ہماری کچھ دیگر مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
آنکھیں ترستیاں ہیں (یادداشتیں)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۳۶/=
میراجی — شخصیت اور فن۔ ترتیب و انتخاب:	کمار پاشی	۴۰/=
واپسی (ناول)	آمنہ ابوالحسن	۱۸/=
برف پر مکالمہ (افسانے)	سریندر پرکاش	۱۸/=
ساحر لدھیانوی — ایک مطالعہ	مخمور سعیدی	۳۰/=
نام بدن اور میں (شاعری)	بمل کرشن اشک	۱۵/=
راجستھانی زبان و ادب — ایک تعارف	ڈاکٹر فضل امام	۱۸/=
گولاگ مجمع الجزائر (تین جلدوں میں)	الیگزینڈر سولینشین (فی جلد)	۱۰/=
منٹو — شخصیت اور فن ترتیب و انتخاب:	پریم گوپال متل	۴۰/=
سو کینڈل پاور کا بلب (منٹو کے ۲۱ منتخب افسانے	″ ″ ″	۱۸/=
کرماں والی (ناول)	کشمیری لال ذاکر	۲۰/=
اداس شام کے آخری لمحے (افسانے)	″ ″ ″	۱۲/=
ہندو مسلمان (ایک موضوعی افسانے)	ہمت رائے شرما	۲۰/=
انتظار حسین کے سترہ افسانے	انتظار حسین	۱۸/=
قصہ جدید و قدیم — ایک ادبی مباحثہ مرتب:	مخمور سعیدی	۱۸/=
سلمیٰ سے دل لگا کر (اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ)	نیر واسطی	۱۸/=
نیا اردو افسانہ — احتساب و انتخاب، مرتب:	کمار پاشی	۱۸/=
چند ادبی شخصیتیں (خاکے)	شاہد احمد دہلوی (مرحوم)	۳۰/=
پہلی کرن کا بوجھ (شاعری)	مغنی تبسم	۱۲/=
روشنی پھر روشنی ہے (شاعری)	بمل کرشن اشک	۱۰/=
افکارِ عبدالحق	مرتبہ: آمنہ صدیقی	۳۵/=
مذہب اور سائنس	بابائے اردو مولوی عبدالحق	۱۱/=
بلۂ صافی (شاعری)	صوفی بانکوٹی (مرحوم)	۱۵/=
دائروں کا سفر (شاعری)	شہاب ملت	۱۵/=
اندھیرے کے قیدی (ڈرامے)	کمار پاشی	۱۰/=
تین چہرے ایک سوال (کہانی)	کشمیری لال ذاکر	۴/۵۰

● کنور سین کے افسانوں میں احتیاط، ضبط و نظم اور ایک پروقار سنجیدگی نمایاں ہے۔ ایک ایک جملہ احتیاط سے تانے بانے میں بُنا گیا ہے۔ یہ افسانے اسی توجہ اور احتیاط سے پڑھے جانے کے مستحق ہیں۔

——— ڈاکٹر محمد حسن

● کنور سین کو افسانہ کہنے کے فن پر مکمل عبور حاصل ہے۔

——— گوپال متل

● کنور سین اکثر کسی کردار کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کی نقل و حرکت کے سہارے قصے کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کے کردار کچھ ایسے بدنصیب افراد ہیں جو اپنی زندگی میں کبھی کراماتی رہے ہوں گے مگر اب اپنے کرتبوں کی اصلیت کھل جانے اور دوسروں کے رُوبرو ذلیل و حقیر ثابت ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار نظر نہیں آتے۔ بلکہ اپنی مجروح انا کے تحفظ کے لیے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر رہے ہیں۔ ان کرداروں کے گرد دیومالائی فضا کا دھندلکا ان کی معنویت کو اُبھارنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

——— کمار پاشی

● کتھا کا عمل انتظار حسین کی کہانیوں میں نظر آتا ہے . . . مگر انتظار حسین بنیادی طور پر داستانوی زبان کے نباض ہیں اور ان کی اہمیت اسی بازیافت میں ہے۔ برخلاف اس کے کنور سین نے ہندوستانی کتھا کو اپنی کہانیوں یا اپنے تخلیقی عمل کا مرکز بنایا ہے۔ انھوں نے کتھا کی زبان استعمال کرنے میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان کتھاؤں کی زبان کو اردو زبان کے ساتھ گھلانے ملانے کی سعی کے ساتھ ساتھ اس آمیزے کو رواں دواں کر دیتے ہیں۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کنور سین ہندی الفاظ کے اور کجنل ٹیسٹ کو برقرار رکھتے ہیں اور عموماً شدھ الفاظ استعمال کرتے ہیں یہ اُردو زبان کو عصری سطح پر ENIRICH کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔

——— مہدی جعفر

● کنور سین کا افسانہ سراب کی مانند دلفریب اور حقیقت کی سفاک ہے۔ اس میں شعر کا افسانوی لہجہ اور افسانے کا شعری آہنگ ایسے منظر نامے کو تشکیل دیتا ہے جس کا تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ کنور سین نے یہ سب کرتے ہوئے کوئی عکس مستعار نہیں لیا۔ اس کے پاؤں اپنی دھرتی پر ہیں۔ قد آور دکھائی دینے کی خواہش میں وہ معلق ہو کر نہیں رہ جاتا۔

——— دیانند گاندھی

● کنور سین کا افسانہ "اس بار نہیں" بلاشبہ کلاسک ادب پارہ ہے . . . میری نظر سے آج تک ادب آرٹ کا ایک بھی نمونہ ایسا نہیں گذرا جس کا موضوع مسیحا کا اعترافِ شکست ہو اور اعترافِ شکست پیغمبرانہ بصیرت اور فکری صداقت کے صدقے بے نظیر تخلیق کی شکل اختیار کرے۔ کنور سین نے علم و آگہی اور فکر و فن کو ہم آہنگ کر کے اردو افسانے کو رفعت، عظمت اور علویت سے ہمکنار کیا ہے۔ ایسی بلند کاوش روایت کو معنویت کا نیا جامہ پہناتی ہے اور آئندہ روایت کے جنم لینے کی ضمانت دیتی ہے۔

——— عتیق الرحمٰن